دانشِ رومیؒ و سعدیؒ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق

دانشِ رومیؒ و سعدیؒ

ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

891.439301 Barq. Dr. Ghulam Gilani
Danish-e-Roomi wa Saadi/ Dr. Ghulam Gilani Barq.- Lahore: Al-Faisal Nashran, 2012.
128p.

1. Hakayat I. Title Card.

ISBN 969-503-803-4

مئی 2012ء
محمد فیصل نے
آر۔آر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/200 روپے

AL-FAISAL NASHRAN
Ghazni Street, Urdu Bazar, Lahore. Pakistan
Phone: 042-7230777 & 042-7231387
http: www.alfaisalpublishers.com
e.mail: alfaisalpublisher@yahoo.com

فہرست

باب اول — بادشاہوں کی سیرت

دوسرا باب — عدل

تیسرا باب — احسان

آٹھواں باب — تربیت

نواں باب — خموشی

دسواں باب — بلند اخلاقی

گیارہواں باب — اقوالِ زرّیں

بارہواں باب — رومیؒ

ابتدائیہ

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی تصانیف وتعارف

ڈاکٹر غلام جیلانی برق 1901ء میں لسبال (ضلع اٹک) میں پیدا ہوئے اور 12 مارچ 1985ء کو اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ آپ کے والد علاقے کے دینی اور مذہبی عالم تھے۔ ان کا نام محمد قاسم شاہ تھا اور گاؤں میں ایک مسجد میں امامت کرتے تھے۔ اور پھر اس مسجد کو خود اپنے وسائل سے تعمیر کروایا۔ جو ابھی لسبال میں قائم ودائم ہے اور جناب قاسم شاہ صاحب اور انکی اہلیہ اسی مسجد کے احاطے میں مدفون ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نسل درنسل ایک مذہبی ودینی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم دینی مدرسوں میں حاصل کی جس میں مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل وغیرہ شامل ہیں۔ پھر بائیس سال کی عمر میں میٹرک کیا اور انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ عربی میں گولڈ میڈل لیا۔ ایم اے فارسی کیا اور 1940ء میں پی ایچ ڈی کیا۔ اس وقت آپ 37 سال کے تھے۔ اور تھیسیس انگلش زبان میں امام ابن تیمیہ لکھا۔ اس کی تصحیح مولانا مودودی سے کروائی۔ پہلے مولوی تھے مسجد میں نماز پڑھاتے تھے پھر 1920ء سے 1933ء تک اسکول ٹیچر رہے پھر 1934ء سے 1957ء تک کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ آپ کے PHD کا تھیسس HARVARD اور OXFORD یونیورسٹیوں سے پاس ہوا۔ اور یوں آپ مولوی غلام جیلانی سے ڈاکٹر غلام جیلانی برق بن گئے۔ آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کی والدہ نے خواب دیکھا کہ آسمانوں میں پرندے اُڑ رہے ہیں اور ان کی چونچوں میں تختیاں ہیں۔ ایک پر ڈاکٹر صاحب کا نام سنہری حروف میں لکھا ہوا ہے۔ اور باقی دوسرے بھائیوں کا نام عام حروف میں لکھا ہے۔

آپ کے بڑے بھائی غلام ربانی عزیز بھی پچیس اسلامی کتب کے مصنف تھے اور گورنمنٹ سروس کے آخر میں قصور کالج سے بطور پرنسپل ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ نے کئی کتب کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ اسلام پر تحقیقی کتب لکھیں جس میں اسلام کا طول وعرض، حکمائے عالم مشہور ہیں۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی نورالحق علوی تھے۔ جو عربی کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ (1915ء تا 1944ء) اور عربی گرائمر پر مستند عالم سمجھے جاتے تھے۔ علامہ اقبال

آپ سے عربی گرائمر اور عربی تاریخ ادب پر اکثر تبادلہ خیال کرتے اور مشورہ لیتے۔ (میری داستان حیات۔ ڈاکٹر برق) اس کا ذکر ڈاکٹر برق صاحب نے اپنی خودنوشت داستان حیات میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے رشتہ دار بھی اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

جناب غلام ربانی عزیز کو 1982ء میں سیرت طیبہ لکھنے پر آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ سیرت طیبہ پر آپ نے دو کتب تحریر کی تھیں۔ برصغیر میں تین بھائی اور تینوں اسلامی علوم کے عالم۔ یہ جناب قاسم شاہ صاحب اور انکی اولاد کے لئے پاک و ہند میں ایک منفرد اعزاز تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بھائی غلام یحیٰی صاحب بھی تعلیم و تدریس کے شعبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اک ہمہ جہت شخصیت اور ایک ادارہ تھے۔ دلکش شخصیت کے مالک اور آنکھوں سے ذہانت عکس ریز تھی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ کا حلقہ احباب وسیع تھا۔ ان میں مولانا مودودی، ڈاکٹر باقر، ڈاکٹر عبداللہ، شورش کاشمیری، پروفیسر اشفاق علی خان، جنرل عبدالعلی ملک (شاگرد) ڈاکٹر فضل الٰہی (جید عالم) مولانا زاہد الحسینی، مولوی غلام جیلانی، پروفیسر ڈاکٹر اجمل، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر سعادت علی خان، عنایت الٰہی ملک (مصنف و مولف) میاں محمد اکرم ایڈووکیٹ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، حفیظ جالندھری، طفیل ہوشیار پوری، جنرل شیریں دل خان نیازی، پروفیسر سعد اللہ کلیم صاحب (مصنف)، کیپٹن عبداللہ خان (مصنف و مولف) صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، شیخ عبدالحکیم، شیخ محمد افضل صاحب سردار امیر اکبر خان (مشہور ایڈووکیٹ) کرنل محمد خان، جنرل شوکت، جنرل شفیق الرحمان، احمد ندیم قاسمی، جسٹس کیانی شامل تھے۔

الفیصل ناشران و تاجران کتب کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کی کتب کو اعلیٰ درجے کی طباعت، کاغذ، متناسب سائز، دیدہ زیب سرورق اور خوب صورت آرٹ و مصوری سے مزین کریں اور قارئین کو پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحب کو خوبصورتی، حسن کائنات، جمال، موسیقیت، فنون لطیفہ سے عشق تھا کیوں کہ بقول ان کے اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ ڈاکٹر برق اک عہد ساز انسان تھے اور مستقبل پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ہم ان کی اس خواہش کو پورا کرنے کی حد درجہ کوشش کر رہے ہیں اُمید ہے ہمارا معیار اشاعت و طباعت قاری کے ذوق سلیم کے مطابق ہوگا۔ کتاب قاری اور مصنف کے درمیان پل کا کام کرتی ہے۔ اس لئے یہ پل یہ رابطہ حسین سے حسین تر کی جانب سفر کرتا رہے گا۔ (انشاءاللہ)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ناشر: محمد فیصل

حرفِ اوّل

انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں ایک ہی نصاب تعلیم رائج تھا۔ جو درسِ نظامی[1] کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں دنیا و عقبیٰ ہر دو کو سنوارنے کی عظیم صلاحیت تھی۔ یہ اسی درس کے فارغ التحصیل طلبہ تھے۔ جنہوں نے بارہ سو سال تک دنیا کو اخلاق عالیہ، تہذیب، فلسفہ، تاریخ اور دیگر علوم کا درس دیا۔ انھی مکاتب سے غزالی (۱۰۵۸ء۔۱۱۱۱ء) و شاہ ولی اللہ (م۔۱۷۶۰ء) جیسے مفکر، بخاری (م۔۸۷۰ء) و مسلم (م۔۸۷۵ء) جیسے محدث، ثعلبی (م۔۱۰۳۷ء) و ابوالفرج الاصفہانی (م۔۹۶۷ء) جیسے ادیب، طبری (۸۳۸ء۔۹۲۳ء) و ابن خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) جیسے مؤرخ، ابو حامد الاصطرلابی (م۔۹۹۰ء) اور ابن الہیثم (م۔۱۰۳۹ء) جیسے انجینئرز، المقدسی (م۔۹۴۶ء) اور یاقوت بن عبداللہ یاقوتی (۱۱۷۹ء۔۱۲۲۹ء) جیسے ماہرین جغرافیہ، بوعلی سینا (۹۸۰ء۔۱۰۳۷ء) و فارابی (۹۵۰ء) جیسے علمائے طبیعی، امام ابو حنیفہ (۶۹۹ء۔۷۶۷ء) و امام شافعی (۷۶۷ء۔۸۲۰ء) جیسے فقیہہ اور دیگر اصناف علوم مثلاً منطق، میراث، موسیقی، مصوری، نحو و عروض، تفسیر، ارضیات و فلکیات کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے۔ علماء و حکماء کے علاوہ ان مدارس سے وہ اہلِ نظر بھی نکلے۔ جو اہلِ شمشیر کے ہمراہ مختلف ممالک میں پہنچے۔ اور صرف فیضِ نظر سے عقاید و مذاہب کی سنگین فصیلوں میں شگاف ڈالتے چلے

[1] یہ نصاب نصیر الدین محقق طوسی (۱۲۰۱ء۔۱۲۷۴ء) نے بغداد کی مشہور درس گاہ "مدرسہ نظامیہ" (قائم شدہ ۱۰۶۴ء) کے لیے وضع کیا تھا محقق طوسی ہلاکو خاں کے وزیر تھے اور یہ نصاب تباہیٔ بغداد کے بعد بنایا تھا۔ سکندر لودھی (م ۱۵۱۷ء) کے زمانے میں ہندوستان کے دو علماء شیخ عزیز اللہ اور شیخ عبداللہ نے اس میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ ایران میں سید شریف علی بن محمد جرجانی (۱۳۳۹ء۔۱۴۱۳ء) اور علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (۱۳۲۲ء۔۱۳۹۰ء) نے اس میں مزید اصلاحات کیں۔ بعد ازاں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۷۶۰ء) نے اس میں چند نئی کتابیں داخل کیں۔ اسی زمانے میں مولانا نظام الدین لکھنؤ کے قریب ایک قصبہ سُہالہ میں درس دیا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی اس نصاب میں کچھ ردّ و بدل کیا اور وہ اس قدر مقبول ہوا کہ ہند و پاک کے تمام مکاتب مثلاً دیوبند وغیرہ میں آج تک وہی نصاب چل رہا ہے۔ مولانا نظام الدین سہالوی کا انتقال ۱۷۴۷ء میں ہوا تھا)

گئے۔ایک زمانہ تھا کہ خیبر سے لاہور تک ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔اور آج ایک بھی کافر نہیں ملتا۔ یہ کرشمہ ہے چند خدامست خرقہ پوشوں کا۔جن میں سے داتا گنج بخشؒ، سلطان باہوؒ، میاں میرؒ اور بابا فرید گنج شکرؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ع نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی ، وہ نگہ کی تیغ بازی (اقبالؒ)

پھر ان کا فیضان قلم دیکھیے۔کہ تصانیف کے انبار لگا گئے۔کتنے ہی ہیں۔جنہوں نے سو یا سو سے بھی زیادہ کتابیں لکھیں۔مثلاً

نام			تعداد تصانیف
۱۔ فارابی	(۹۵۰ء)	تقریباً	۱۰۰
۲۔ امامِ رازی	(۱۲۱۱ء)	،	۱۲۵
۳۔ ابن الحجر العسقلانی	(۱۴۴۸ء)	،	۱۵۰
۴۔ امامِ غزالی	(۱۰۵۸ء)	،	۲۰۰
۵۔ ابن العربی	(۱۲۴۰ء)	،	۲۵۰
۶۔ بوعلی سینا	(۱۰۳۷ء)	،	۲۲۵
۷۔ عبدالغنی النابلسی	(۱۷۲۸ء)	،	۳۰۰
۸۔ امام ابنِ تیمیہ	(۱۳۲۷ء)	،	۵۰۰
۹۔ جلال الدین سیوطی	(۱۵۰۶ء)	،	۵۵۰
۱۰۔ ابن طولون دمشقی	(۱۵۴۶ء)	،	۷۵

عظمت و وقار کا یہ عالم کہ جب ہارون الرشید (خلافت ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) نے امام مالکؒ (۷۱۳ء۔۷۹۶ء) کو لکھا کہ بغداد میں تشریف لایئے۔آپ سے قرآن و حدیث پڑھنا چاہتا ہوں۔تو جواب ملا:۔

ع خیز و اندر حلقۂ درسم نشیں، (اقبالؒ)

کہ اٹھو اور میرے حلقۂ درس میں آ کر شامل ہو جاؤ۔

عدل و انصاف کی یہ کیفیت، کہ جب ٹرکی کے ایک بادشاہ مراد اول (سلطنت ۱۳۶۰ء۔ ۱۳۸۹ء) نے ایک معمار کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ تو قاضی سلطنت نے قصاصاً اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور دلیل یہ دی کہ:۔

ع[1] خون شہ رنگین تراز معمار نیست (اقبالؒ)

تقدس کی یہ حالت، کہ ان لوگوں کے مزار صدیوں سے زیارت گاہِ عوام بنے ہوئے ہیں دنیا دور دور سے آتی اور ان کی آرام گاہوں پہ اشک وعقیدت کے پھول چڑھاتی ہے۔

ایک سوال

سوال یہ ہے کہ آج انسانوں کی یہ عظیم ومقدس صنف کہاں چلی گئی؟ ہماری یونیورسٹیوں سے اب رازی وسینا، بخاری ومسلم اور رومی وسعدی کیوں پیدا نہیں ہوتے؟ کہتے ہیں کہ علم ایک نور ہے۔ اس نور کو تقسیم کرنے کے لیے ملک میں آٹھ یونیورسٹیاں، سینکڑوں کالج اور ہزارہا مدارس جاری ہیں۔ جن میں اندازاً آٹھ ہزار پروفیسر اور ایک لاکھ سے زائد ٹیچر کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان درسگاہوں سے جو مخلوق نکل رہی ہے۔ وہ اٹھانوے فیصد شب پرست، تصورات عالیہ سے نا آشنا، منزل حیات سے بے خبر، بے عمل، شکم پرست اور عیش کوش ہے۔ یہ کیوں؟

جواب سوال

بات یہ ہے کہ اس برصغیر پر فرنگ نے دوسو سال تک حکومت کی۔ یہاں اس نے ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کیا تھا۔ جس کا پہلا مقصد اہلکار اور ایجنٹ پیدا کرنا۔ دوسرا، اہل ملک کی غیرت وحمیت سے بیگانہ بنانا۔ اور تیسرا ان سے ان کا مذہب چھیننا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ یورپ میں اخلاقی و روحانی اقدار کا کوئی تصور موجود نہیں۔ اہل یورپ کا کام، ایشیاء وافریقہ کی غریب اقوام کو لوٹنا، ان کے مال پر عیش اڑانا۔ شراب پینا، ناچنا، کمزوروں کو پیٹنا، پسماندہ ممالک کے خلاف سازشیں کرنا اور علم جیسے مقدس جوہر کو انسانیت کی تخریب وتباہی کے لیے استعمال کرنا ہے۔ آپ اس حقیقت

---

[1] ترجمہ: کہ بادشاہ کا لہو معمار کے لہو سے زیادہ سرخ نہیں۔

سے بھی آگاہ ہیں کہ دنیا کی لیڈر شپ (قیادت) بارہ سو برس تک مسلمانوں کے پاس رہی۔ اخلاق وفلسفہ کے معلم ہم تھے۔ دنیا علوم وفنون سیکھنے کے لیے ہماری یونیورسٹیوں میں آتی تھی۔ ایک طرف ملتان سے کوہ قاف تک اور دوسری طرف ترکستان سے مراکش تک ہمارا علم لہرا رہا تھا۔ مغربی یورپ آٹھ سو برس تک ہمارے تسلط میں رہا۔ رومانیہ، ہنگری، سرویہ، یوگوسلاویہ، یونان، شمالی اٹلی، پولینڈ، آسٹریا، سسلی، مالٹا اور قبرص پر صدیوں ہم قابض رہے۔ عیسائی دنیا بارہ سو برس تک ہم سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتی رہی۔ بالآخر بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ہم گر گئے۔ اور فرنگ ہماری چھاتی پر چڑھ بیٹھا، پہلے اس نے ہماری پسلیاں توڑیں۔ پھر فاقے دیے اور بعد ازاں ایک ایسا نصاب تعلیم وضع کیا۔ جس سے حریت، حمیت، ملی غیرت خدا اور رسول سے محبت اور رفعت وعظمت کے تمام تصورات مٹ گئے اور ہم نرے ''صاب'' بن کر رہ گئے۔

اس نصاب نے ہمیں یہ تاثر دیا:۔

۱۔ کہ مذہب اک داستانِ پارینہ ہے۔ جو عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

۲۔ کہ زندگی کا انجام موت ہے۔ اور مقصد کھانا، پینا، ناچنا اور عیش اڑانا ہے۔

۳۔ کہ انگریزی اُمُّ الْاَلْسِنَۃ اور سرچشمہ تہذیب ہے۔

۴۔ کہ لاطینی رسم الخط نہایت ترقی یافتہ خط ہے۔ اسے رواج دے کر قرآنی حروف سے جان چھڑانا ترقی کے لیے ضروری ہے۔

۵۔ کہ انسانیت کے بڑے بڑے محسن یورپ میں پیدا ہوئے تھے۔ مثلاً کلائیو، کپٹن ڈریک، نیلسن، ملٹن، بائرن وغیرہ۔ اور یہ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے لوگ مثلاً غزالی، ابن العربی، رازی، فارابی وغیرہ تاریکی میں بھٹکنے والے اندھے تھے۔

۶۔ کہ یورپ کے دشت وجبل، باغ وراغ اور ارض وسما بے حد حسین ہیں۔ کام کے دریا دو ہی ہیں۔ ڈینوب ٹیمز اور یہ سندھ، چناب اور دجلہ ونیل گندے نالے ہیں۔ ککو پرندوں کا بادشاہ ہے۔ اور یہ بلبل، چکور، کوئل اور مور سب کے سب بیہودہ وبے کار ہیں۔

ان تاثرات کو واضح کرنے کے لیے یورپ نے ہندوستان میں انگریزی کتابوں کے انبار لگا دیئے۔ مصور رسالے لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیے۔ فحش وعریاں فلم دکھائے۔ ہمارے ہزار ہا نوجوان کو یورپ لے جا کر زن وبادہ کا پرستار بنایا۔ اور یہ صورت حال اب تک باقی ہے۔

مذہبی تصورات کے خلاف یورپ کا مؤثر ترین حربہ اس کی غلیظ اور گندی فلمیں ہیں۔ جو مردوں کو مے نوشی، قمار بازی، ڈاکہ زنی اور عیاشی کا سبق دیتی ہیں۔ اور عورتوں کو برہنگی، بے حیائی اور عصمت فروشی سکھاتی ہیں۔ ہمارے اونچے گھرانوں کا کمال دیکھیے کہ ایسی فلموں کو اپنی جوان لڑکیوں سمیت دیکھتے ہیں اور اب رفتہ رفتہ یہ حالت ہوتی جاتی ہے کہ بقولِ اکبر۔

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حیا اس کو نہیں آتا ، اسے غصہ نہیں آتا

یورپ مسلمان کے تن وتوش سے نہیں گھبراتا۔ بلکہ اسلامی ذہنیت سے ڈرتا ہے۔ وہی ذہنیت جو دنیا کے کسی فرعون ونمرود کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جو آگ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بے محابہ کود پڑتی ہے۔ جو دنیوی سامان طرب کو موت اور موت کو زندگی سمجھتی ہے۔ جو باطل کے طوفانوں سے منزلوں آگے بڑھ کر ٹکراتی ہے۔ اور جو سرمایہ دارانہ نظام کے کاشانوں پر موت اور آگ برساتی ہے۔ انگریز نے یہ نظام تعلیم اسی ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے وضع کیا تھا اور مجھے اعتراف ہے۔ کہ انگریز کی یہ چال بے حد کامیاب رہی۔ گو آج پاکستان کی عمر سولہ برس ہو چکی ہے۔ لیکن نظام تعلیم اسی نہج پہ چل رہا ہے۔ کتابوں میں عشقیہ افسانوں اور لایعنی داستانوں کی وہی بھرمار ہے۔ اور بے مقصد نظموں کی وہی تکرار، طلبہ میں خدا اور رسول سے بے اعتنائی کا وہی عالم ہے اور کج اندیشی وکج روی کی وہی کیفیت۔ وجہ یہ کہ نظام تعلیم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن میں اکثر انگریز کے سانچوں سے ڈھل کر نکلے ہیں اور جنہیں ہر مشرقی واسلامی چیز بدرنگ وقبیح نظر آتی ہے۔

علم، کیسا علم؟

علم کے بغیر تو چارہ نہیں۔لیکن علم کی درجنوں قسمیں ہیں۔سوال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو کس قِسم کا علم چاہیے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام ہماری دنیا وآخرت ہر دو کو سنوارنا چاہتا ہے۔اس لیے ہمارے لیے وہی علم کارآمد ہوسکتا ہے۔جو ہمیں دنیا وعقبیٰ ہر دو میں سرخ رو بنائے۔دنیوی علم میں سائنس کا مقام سب سے اونچا ہے کہ اس کے بغیر ہم کائنات کے دفائن وخزائن مثلاً فولاد، بجلی، پٹرول، گیس وغیرہ سے متمتع نہیں ہو سکتے۔اس کے بعد حساب، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، شہریت، فلسفہ وغیرہ کا درجہ آتا ہے۔رہی آنے والی زندگی۔تو لاکھوں انبیاء وفلاسفہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے۔کہ وہ صرف پاکیزگی وعبادت سے سنورتی ہے۔اور یہ صفات اس لٹریچر سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو ہمارے عظیم اسلاف کے قلم سے نکلا تھا۔

بلندی وپستی

کتنی ہی بلندیاں ہیں۔جو پست نظر آتی ہیں۔آپ کو ایک سرمایہ دار جو اونچے محلوں میں رہتا اور طیاروں میں سفر کرتا ہے۔بلند نظر آتا ہوگا۔اور تمام خاک نشین دکھائی دیتے ہوں گے۔لیکن اصلیت کچھ اور ہے۔ان خاک نشینوں میں بعض ایسے بھی تھے۔جو بلند ہوتے ہوتے اس مقام پہ جا پہنچے کہ ان میں اور ربِ کائنات میں بالشت بھر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ خدارا سوچو۔کہ موسیٰؑ بڑا تھا یا فرعون؟ ابراہیمؑ بڑا تھا یا نمرود؟ رام بڑا تھا یا راون؟

فرض کیجیے کہ ایک لفنگا زید کے منہ پہ بے وجہ تھوکتا اور گالیاں بکتا ہے۔زید اسے معاف کر دیتا ہے۔سو قدم آگے وہ عمر سے بھی یہی سلوک کرتا ہے۔لیکن عمر اس کے سر پر اس زور سے لٹھ رسید کرتا ہے کہ اس کا بھیجا باہر آجاتا ہے۔فرمایئے زید وعمر میں بڑا کون ہے؟

ایک شخص ہر روز ایک ہزار روپیہ کما کر بینک میں جمع کر دیتا ہے اور دوسرا صرف دو روپے کماتا ہے۔جس میں سے آٹھ آنے وہ اپنے اندھے ہمسائے کو دے آتا ہے۔بتاؤ ان میں بڑا کون ہے؟ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ سخاوت بلندی ہے اور بخل پستی اس طرح تواضع، رحم، عدل، تحمل،

صبر، خدمتِ خلق وغیرہ بلندیاں ہیں اور غرور، کم ظرفی، بے صبری، خلق کے دکھ درد سے بے نیازی، بے رحمی اور بے انصافی وغیرہ وہ پستیاں ہیں۔ جن سے انسانیت کو نکالنے کے لیے سوا لاکھ انبیاء مبعوث ہوئے تھے۔

اسلام کیا چاہتا ہے؟

وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس کا علم جہاں گیر ہو۔ اور عشق خدا گیر۔ جو صاحب کلاہ بھی ہو اور صاحب نگاہ بھی۔ جس کا سر خاک پہ ہو اور خیال افلاک پر۔ جب ایک انسان جبیں نیاز زمین پہ رکھ کر رب السماء کو پکارتا ہے۔ تو وہاں سے نور و سرور کی شبنم خیابان دل پہ ٹپکتی اور کیف و سرور کا اک عالم رچا جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کو دل میں بسا کر خود اس کی ذات میں بس جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی لذت میں کھو جاتے ہیں کہ جہانِ ہست و بود کا کوئی سانحہ ان کی محویت میں مخل نہیں ہو سکتا۔

الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب۔ (قرآن)

(یاد رکھو کہ دلوں کو سکون صرف اللہ کی یاد سے حاصل ہوتا ہے)

آج دنیا اور خصوصاً یورپ ترکِ عبادت کی وجہ سے سکونِ قلب کی نعمت سے محروم ہے۔ ہر چند کہ وہاں کاریں بھی ہیں اور کوٹھیاں بھی۔ شراب و کباب بھی ہے اور چنگ و رباب بھی۔ دولت کے انبار بھی ہیں اور حسن و رنگ کی بہار بھی۔ لیکن وہ لوگ انتہائی اضطراب کا شکار ہیں اور ان کی روح کسی گم شدہ جنت کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ یاد رکھو اس جنت کی کلید اللہ کی عبادت ہے و بس۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نا محکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی (اقبالؒ)

اس وقت ہم ایک نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں۔ بھارت ہمیں ختم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ ہمارے حلیف یعنی امریکہ و برطانیہ در پردہ بھارت سے ملے ہوئے ہیں ہم امریکہ کی طرف دست دوستی بڑھائیں تو روس دھمکاتا ہے۔ روس کا رخ کریں تو لندن سے واشنگٹن تک اک کہرام مچ جاتا ہے۔ ان مشکلات کا واحد حل رب کائنات سے ربطہ مہر و ولا قائم

کرنا۔ اوراس کی دہلیز پر سر جھکانا ہے۔

اگر کسی طرح ہم اللہ کو اپنا بنالیں۔ تو پھر ہم اس قدر مہیب وجلیل بن جائیں گے۔ کہ ہماری ایک للکار سے کائنات لرزہ براندام ہو جائے گی۔ اور اگر ہم عشق یعنی عبادت کی قوت سے محروم رہے تو کوئی قدم سیدھا نہیں پڑے گا۔ اور کوئی تیر نشانے پر نہیں بیٹھے گا۔ عشق بڑی چیز ہے۔ اک عظیم منبع قوت۔ ایک بے نظیر وسیلۂ عظمت اور کائنات کی سب سے بڑی دولت:

عشق کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
عشق ہے میروں کا میر عشق ہے شاہوں کا شاہ
علم فقیہہ و حکیم عشق مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ ، عشق ہے دانائے راہ
عشق ہے مقامِ نظر علم مقام خبر
عشق میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ
چڑھتی ہے جب عشق کی سان پر تیغ خودی ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
علم کا موجود اور عشق کا موجود اور
اشھد ان لا الہ اشھد ان لا الہ

(اقبالؔ)

کچھ اس کتاب کے متعلق

میں ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۰ء تک مکاتب میں پڑھتا رہا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۳ء تک سکولوں اور کالجوں میں پڑھتا رہا۔ مکاتب کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ طلبہ نہایت مؤدب، متواضع، قانع، خدمت شعار، پابند صوم وصلوٰۃ، باحیا اور پرہیز گار تھے۔ جب استاد برائے تدریس تشریف لاتے، تو طلبہ آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ چومتے۔ سبق کے دوران میں سانس کی آواز تک نہ اٹھتی۔ اگر کوئی طالب العلم کسی ضرورت کے لیے حلقۂ درس سے باہر جاتا۔ تو دور تک الٹے پاؤں چلتا جاتا۔ تاکہ

استاد کی طرف پیٹھ نہ ہونے پائے۔ مجھے دو ایسے اساتذہ سے بھی فیض اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ جن کا گزر اوقات چند کنال زمین پہ تھا۔ اس میں ہم طلبہ ہی ہل چلاتے اور وقت آنے پہ فصل کاٹتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ خدمت استاد میں دوسروں سے سبقت لے جائے دوسری طرف اساتذہ کا یہ حال، کہ صبح سے شام تک مفت پڑھاتے۔ ہر نماز کے بعد انبیاء و اولیاء کی حکایات سناتے تقویٰ وطہارت کی فضیلت بتاتے اور تمام فضائل و ذمائم پہ روشنی ڈالتے تھے۔ نور عبادت سے ان کی جبیں یوں روشن تھی:

ع جس طرح تارے چمکتے ہوں اندھیری رات میں (اقبالؔ)

شخصیت میں اتنی کشش تھی کہ ہم پروانوں کی طرح ان کا طواف کرتے تھے۔ احترام و وجاہت کا یہ عالم تھا کہ ہم انھیں اپنا پیر و مرشد سمجھتے تھے۔

وہاں سے سکولوں اور کالجوں میں آیا۔ تو دنیا ہی نئی دیکھی۔ اساتذہ بے عمل اور طلبہ بے ادب۔ آئے دن گستاخی کی شکایات، قدم قدم پہ اساتذہ سے مذاق، سال میں ایک دو ہڑتالیں۔ اور کبھی کبھی سرِ بازار استاد کی توہین۔ سوچنے لگا کہ یہاں کی دنیا وہاں سے اتنی مختلف کیوں ہے؟ چالیس سال کے بعد مجھ پہ یہ نکتہ کھلا۔ کہ اصل چیز نصاب تعلیم ہے۔ وہاں رومی و سعدی عطار اور جامی کی حکمت و دانش پڑھائی جاتی تھی اور یہاں بائرن اور براؤننگ کے خرافات کا درس دیا جاتا ہے۔ وہاں ہر قدم حرم کی طرف اٹھتا تھا۔ اور یہاں کوئے صنم کی طرف، وہاں کے مے خانوں میں مے یثرب تھی۔ اور یہاں کے بادہ کدوں میں غلاظت مغرب وہاں تصورات کا محور خدا تھا۔ اور یہاں زن، زر اور ساغر و مینا۔

یوں تو اس نصاب کا ہر ورق قبلہ نما بلکہ خدا نما تھا۔ لیکن اثر انداز بیاں اور نکتہ آفرینی کے لحاظ سے سعدی و رومی کا مقام اتنا بلند ہے۔ اور ذہنوں پہ اس کی گرفت اتنی شدید ہے کہ اگر اس نصاب میں صرف رومی و سعدی ہی ہوتے۔ تب بھی طلبہ کی روحانی بلندی کا وہی عالم ہوتا۔

میرا واویلا

اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہی میں نے اخبارات میں شور مچایا بعض حکام تعلیم سے خود جا

ملا۔ کہ خدا کے لیے میری قوم کے بچوں کو تباہ نہ کرو۔ ان کی دنیا و آخرت پہ آگ مت برساؤ۔ اور جلد تر دو قدم اٹھاؤ۔

اول: اساتذہ کو بلند کردار و تقوٰی شعار بننے کا حکم دو۔

دوم: اردو اور انگریزی مضامین کے نصاب کی بنیاد رازی، غزالی، سعدی وغیرہ کی دانش و حکمت پہ رکھو۔

لیکن میری بات کسی نے نہ سنی۔ ہماری درسگاہوں میں فکرِ فرنگ کا غلیظ دریا بدستور رواں ہے جس میں ہمارے نوجوان ڈوب ڈوب کر مر رہے ہیں۔ نہ جانے اس صورت حال کی اصلاح کب اور کیسے ہوگی؟

اے مسلمانان! فغان از فتنہ ہائے علم و فن

اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب (اقبالؔ)

(اے مسلمانو! علم و فن کے فتنوں سے فریاد، آج دنیا میں شیطان ہر جگہ ملتا ہے اور خدا کہیں بھی نہیں۔ انقلاب، انقلاب اے انقلاب)

شوخیِ باطل نگر اندر کمین حق نشست

شپر از کوری شبخونے زند بر آفتاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب (اقبالؔ)

(باطل کی جرأت دیکھو کہ سچائی کی گھات میں جا بیٹھا۔

اور اندھی چمگادڑ آفتاب پہ حملہ آور ہوگئی۔

انقلاب، انقلاب اے انقلاب)

من درون شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام

آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب، انقلاب اے انقلاب (اقبالؔ)

(میں عصرِ رواں کی بوتلوں میں وہ زہر دیکھ رہا ہوں۔
کہ اگر سانپ دیکھ پائے۔ تو غش کھا جائے۔
انقلاب، انقلاب اے انقلاب)

ہدایت بہ حکایت

حکایت کے رنگ میں بات کہنے کا طریقہ بہت پرانا ہے ابتداء سے والدین بچوں کو اخلاقی کہانیاں سناتے چلے آتے ہیں۔ دیہات میں آج بھی اتنی حکایات بیان ہوتی ہیں کہ اگر صرف ایک ہزار مربع میل علاقے کا مواد جمع کیا جائے تو کئی جلدیں بن جائیں۔ ہر زبان کے ادب میں انسانوں اور داستانوں کا یہی ہجوم ہے۔ عصر حاضر کا افسانوی ادب قدیم محاکات کی جدید صورت ہے۔ قدیم و جدید میں سے بہتر کون سی صورت ہے؟ اس کا جواب آسان نہیں۔ قدیم ادب میں کتنی ہی ایسی حکایات ملتی ہیں۔ کہ انھیں پڑھ کر انسان پھڑک اٹھتا ہے۔ مثلاً

۱۔ ایک دفعہ اللہ نے آسمانوں پر ایک وسیع دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں تمام نیکیوں کو بلایا۔ دعوت کے دوران میں ایک فرشتے نے دیکھا کہ ایک میز پر دو نیکیاں یوں چپ چاپ بیٹھی ہیں۔ گویا ایک دوسرے سے روٹھی ہوئی ہیں۔ فرشتہ پاس گیا اور حیرت سے پوچھا۔ کیا آپ ایک دوسرے کو نہیں جانتیں؟ جواب ملا ''نہیں'' اس نے ایک طویل قہقہہ لگاتے ہوئے ان کا یوں تعارف کرایا۔ یہ ہیں ''احسان'' اور آپ ہیں شکریہ۔ اور پھر ہنستے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ (کالی داس)

۲۔ اللہ نے جب عورت کو پیدا کیا۔ تو آسمانوں میں یہ خبر پھیل گئی کہ یہ ایک کم عقل مخلوق ہے۔ چنانچہ مردوں نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ ادھر عرش الٰہی سے دمادم یہ صدا آ رہی تھی۔ کہ اس کے ساتھ گزارہ کرنا ہی پڑے گا۔ اس پر مردوں نے ایک بہت بڑے دانشور کو منتخب کر کے التماس کی۔ کہ آپ تجربتہً ایک عورت کو گھر لے جائیں۔ اور ہفتے عشرے کے بعد رپورٹ کریں۔ کہ اس کے ساتھ گزر ممکن ہے یا نہیں؟

دس دن کے بعد وہ دانشور عورت کو ساتھ لیے خدا کے حضور میں گیا۔ اور کہا اے رب! اس عورت نے اپنی زبان درازی، بات بات پہ بدظنی اور دن رات کی چخ چخ سے میری زندگی دوبھر کر دی ہے، اس لیے میں اسے واپس کرتا ہوں۔ اور ساتھ ہی یہ اعلان کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ مرد کا گزارہ ناممکن ہے۔ اس پر بھگوان مسکرائے اور عورت نے خود شادی کر لی۔ لیکن اس کے بعد آج تک آسمان والوں نے بھگوان کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔　　(کالی داس)

۳۔　آج سے اندازاً ساڑھے چار ہزار برس پہلے دو شاعر یونان کے شاہی دربار میں رہتے تھے۔ ایک کا نام اُمیرس تھا۔ غالب کی طرح خیال آفرین و نکتہ سنج۔ اور دوسرا ذوق کی طرح تنگ بند و لاف زن۔ ایک دن بادشاہ نے پوچھا۔ کہ تم میں سے بڑا شاعر کون ہے؟ وہ تنگ بند جھٹ بول اٹھا:۔

''حضور! اس معاملہ میں تو کسی قسم کا اشتباہ ہے ہی نہیں۔ گذشتہ ایک سال کے دوران میں میرے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ اور اُمیرس نے صرف دو یا تین نظمیں لکھی ہیں۔ میرا اور اس کا کیا مقابلہ۔''

بادشاہ نے پوچھا'' کیوں اُمیرس! ہے کوئی جواب؟ اس پر اُمیرس نے کہا:۔

''سنا ہے کہ ایک مرتبہ انطاکیہ کے جنگلوں میں ایک سورنی شیرنی کے پاس گئی اور کہنے لگی۔ کہ اے ملکۂ جنگل۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ تم سال میں صرف ایک بچہ جنتی ہو اور میں خدا کے فضل سے اتنے جنتی ہوں کہ میرے گھر کا وسیع دالان بھر جاتا ہے۔ جواباً شیرنی نے کہا۔ میرے لیے یہ ناز کیا کم ہے کہ میرا ایک بچہ شیر ہوتا ہے اور تمہارے سب کے سب سؤر کے بچے۔''

۴۔　ایک مرتبہ اُمیرس سے کسی نے کہا۔ کہ فلاں شخص ہر جگہ اور ہر محفل میں آپ کو برا کہتا ہے۔ اُمیرس نے جواب دیا:

''ایک مرتبہ ایک بندر اور ایک کتا کہیں جا رہے تھے۔ راہ میں ایک ٹیلہ آ گیا بندر اس پر چڑھ گیا۔ اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا۔ کتے نے پوچھا۔ کہ یہ کیا کر رہے ہو۔ کہنے لگا۔ یہ ایک قبرستان ہے۔ جس میں کئی شیر اور

چیتے دفن ہیں یہ تمام کے تمام میرے خانسامے، بیرے، خاکروب اور دھوبی تھے۔ ان پہ فاتحہ پڑھ رہا ہوں'' کتا کہنے لگا۔

''کاش کہ یہ زندہ ہوتے اور تم ان کے سامنے یہی بات کہتے۔''

(القفطی۔ تاریخ الحکماء۔ اُمیرس)

حکایات رومیؒ وسعدیؒ

رومی وسعدی نے بھی اپنا عظیم وتنومند پیغام لباس حکایت میں پیش کیا تھا۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ رومی مست ہے اور سعدی ہشیار۔ رومی زمین کی بات آسمان پہ بیٹھ کر سناتا ہے اور سعدی قصۂ زمین برسرِ زمین بیان کرتا ہے۔ رومی سراپا عشق ہے۔ اور سعدی علم و عشق کا ایک رنگین امتزاج۔ رومی کی نظر حقائق ومعانی پہ رہتی ہے۔ اور وہ لفظی جگمگ کی پرواہ نہیں کرتے۔ لیکن سعدی فصاحت، سلاست، صوتی موسیقی، سجع بندی چست تراکیب اور ہم صورت الفاظ پہ جان دیتا ہے۔ اور درحقیقت وہ اس فن کا بادشاہ ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ بادشاہ نے تھیلی لے کر دریچہ سے سر باہر نکالا اور درویش سے کہا۔ ''دامن بدار'' (دامن پھیلاؤ) گفت دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ (کہا۔ دامن کہاں سے لاؤں کہ تن پہ جامہ ہی نہیں)

۲۔ تا کار بہ زر می آید　　جاں در خطر افگندن نشاید

(اگر کام زر سے نکل سکے تو جان کو خطرے میں نہ ڈالو)

۳۔ نصیحت از دشمن پذیرفتن خطاست　　لیکن شنیدن رواست

(دشمن کا مشورہ ماننا خطا۔ لیکن سننا روا ہے)

۴۔ دو کس دشمن ملک ودیں اند　　بادشاہ بے حلم وزاہد بے علم

(دو شخص ملک ودین کے دشمن ہیں۔ بادشاہ بے حلم اور زاہد بے علم)

۵۔ ہر کس را عقل خود بکمال وفرزند خود بجمال نماید

(ہر شخص کو اپنی عقل جلیل اور اپنا فرزند جمیل نظر آتا ہے)

۶۔ اگر شبہا ہمہ شب قدر بودے　　شب قدر بے قدر بودے

(اگر ہر رات شب قدر ہوتی۔ تو شب قدر کی کوئی قدر نہ رہتی)

۷۔ جوہر اگر در خلاب افتد ہماں نفیس است　　وغبار اگر بر فلک رود ہماں خسیس

(موتی اگر کیچڑ میں گر پڑے تو نفیس ہی رہتا ہے اور غبار خواہ آسمان پر پہنچ جائے ذلیل ہی رہتا ہے)

سعدی کا ترجمہ آسان نہیں۔ اس کا مفہوم تو ادا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی فصاحت سلاست، موسیقی، ترنم اور سجع بندی کو اردو میں منتقل کرنا محال ہے۔

مقصد ہیئت کتاب

اس کتاب کی ہیئت یہ ہے کہ سعدی کی بوستاں و گلستان اور رومی کی مثنوی میں سے کچھ حکایات منتخب کر کے ان کا مفہوم و ملخص اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ کہیں کہیں گلستان کے بعض ہم وزن و مترنم الفاظ کو جوں کا توں اردو میں منتقل کر دیا ہے تا کہ صوتی اثرات باقی رہیں اور اس کتاب کا مقصد یہ کہ ہم بلند و پست، نور و ظلمت اور خیر و شر میں امتیاز کر سکیں۔ اسلامی اقدار کو پہچانیں۔ سینوں کی سوز و گداز، خلوتوں کو ناز و نیاز، خاکستر کو شرر اور راتوں کو نوا ہائے سحر سے آباد کر سکیں۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

سعدیؒ

سعدی کی حکایات سننے سے پہلے اس کی داستان حیات پڑھ لیجئے۔

نام، لقب، ولادت وغیرہ

سعدیؒ کا خاندان کئی پشتوں سے شیراز میں آباد تھا۔لیکن اس خاندان کے بعض افراد طاؤس میں رہتے تھے۔یہ قصبہ شیراز سے چار فرسنگ کی مسافت پہ واقع تھا اور آج اس کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔سعدیؔ کی ولادت (۶۰۳ھ۔۱۲۰۷ء) اسی قصبے میں ہوئی تھی۔بعد از ولادت اپنی والدہ کے ساتھ شیراز لایا گیا۔اور وہیں اس کا بچپن اور بڑھاپا گزرا۔

جلال الدین بغدادی اپنی کتاب حالات سعدیہ میں لکھتا ہے کہ سعدی سے میرے تعلقات

لے گو سعدی کے حالات بیسیوں مصنفین نے لکھے ہیں۔مثلاً مولانا حالیؔ، شبلی، براؤن، رضازادہ شفق وغیرہ لیکن جو واقعات مرزا حیرت دہلوی نے اپنی ایک گمنام کتاب ''سوانح عمری شیخ سعدیؒ'' میں جمع کیے ہیں وہ اور کہیں نہیں ملتے۔یہ کتاب ۱۸۹۴ء میں طبع ہوئی تھی۔مرزا صاحب نے جن کتابوں سے مواد حاصل کیا ان میں بعض کے نام یہ ہیں۔(i) حالات سعدیہ: از جلال الدین بغدادی

(ii) گوہر نایاب (iii) سبزہ زار ایران: ان دونوں کتابوں کے مصنفین کے نام مرزا صاحب نے درج نہیں کیے۔ مرزا صاحب اپنی کتاب کے ص ۷ پر لکھتے ہیں:

''شیخ کے بچپن کے حالات ہمیں متعدد کتابوں میں ملتے ہیں جن میں سے بہت سی کتابیں قرطبہ میں تصنیف ہوئیں جو اب ہندوستان میں بہت کمیاب بلکہ عنقا ہیں۔ہمیں فخر ہے کہ سفر مصر القاہرہ میں ہمیں خوش قسمتی سے یہ کتابیں ہاتھ لگ گئیں جن سے ہم اس قابل ہوئے کہ اپنے مشرقی فاضل کے حالات کشادگی کے ساتھ قلم بند کریں۔(ص ۷)

(iv) تذکرۂ فقیر از سعدی: اس کتاب کا ذکر مرزا حیرت نے پہلی مرتبہ کیا ہے۔اس سے پہلے یہ نام کسی تذکرے میں نہیں ملتا۔

(v) ٹی جانسٹن ہیلسمر ے کی کسی کتاب سے سعدی کے متعلق واقعات نقل کیے ہیں لیکن کتاب کا نام کہیں درج نہیں کیا۔

(vi) ایشیاٹک ریسرچز از جانسن۔یہ جانسن کون ہے؟ یہ کتاب کہاں اور کس سال طبع ہوئی تھی کہیں مذکور نہیں۔

ان نقائص کے باوجود مرزا حیرت کی بیان کردہ کہانی قدرے مفصل اور دلکش ہے اور ہم یہاں اسی کو کچھ اضافوں کے ساتھ دہرا رہے ہیں۔زبان میری ہے اور مواد بیشتر مرزا حیرت کا۔

بہت گہرے تھے۔ وہ جب تک بغداد میں رہا۔ ہم ہر روز بلا ناغہ ملتے رہے۔ ان صحبتوں میں سعدی کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کا خاندان دراصل مکہ سے ہجرت کر کے شیراز گیا تھا اور وہ فاطمی سید تھے۔

بعد از ولادت سعدی کا نام دادا کے نام پر مشرف الدین رکھا گیا۔ والد کا نام عبداللہ تھا جو اپنے علم و تقدس کی بنا پر بڑی عزت کے مالک تھے۔ یہاں تک کہ شیراز کا فرماں روا سعد بن زنگی بن مودود (سلطنت ۵۹۱ھ۔۶۲۳ھ = ۱۱۹۵ء۔۱۲۲۶ء) ان کی خدمت میں اکثر برائے سلام و دعا جایا کرتا تھا۔ اور اس نے اس خاندان کا وظیفہ بھی باندھ رکھا تھا۔ مشرف الدین نے اسی سعد کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اپنا تخلص سعدی رکھ لیا تھا۔

تاریخ ولادت

سعدی کی تاریخ ولادت کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں۔

۱۔ پروفیسر براؤن	=۵۷۹ھ	=۱۱۸۴ء بتاتا ہے
۲۔ پروفیسر اے جے آربری[1]	=۵۷۹ھ تا ۵۸۰ھ	=۱۱۸۴۔۸۵ء
۳۔ مولانا شبلی[2]	=۶۰۶ھ	=۱۲۱۰ء
۴۔ مرزا حیرت	=۵۷۵ھ	=۱۱۸۰ء
۵۔ رضازادہ شفق[3]	=۶۰۶ھ	=۱۲۱۰ء

مرزا حیرت اپنی کتاب ''سوانح عمری شیخ سعدی'' کے ص ۲۹ پر ''حالات سعدیہ'' (جلال الدین بغدادی) کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ اتابک سعد بن زنگی نے سعدی سے پوچھا۔ کہ تمہاری عمر کتنی ہے؟ کہا کہ آپ کی سلطنت سے بارہ برس چھوٹا ہوں۔ سعد زنگی ۵۹۱ھ = ۱۱۹۵ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اس میں بارہ جمع کیجیے تو ۶۰۳ھ = ۱۲۰۷ء بنتا ہے۔ لیکن گلستان کے باب پنجم میں سعدی کہتا ہے:۔

---

[1] کلاسیکل پرشین لٹریچر از پروفیسر آربری ص ۱۸۸
[2] شعر العجم حصہ دوم ''سعدی''
[3] تاریخ ادبیات ایران طبع تہران ص ۲۴۹

"سالے کہ محمد خوارزم شاہ باختا برائے مصلحتے اختیار کردبہ جامع کاشغر

درآمدم..........."

جس سال کہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے چین سے صلح کی تھی میں کاشغر کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک لڑکا نحو کا سبق یاد کر رہا تھا اور اس مثال ضرب[1] زید عمرو اکو بار بار دہرا رہا تھا۔ میں نے کہا کہ چین و ترکستان میں تو صلح ہوگئی ہے لیکن زید و عمرو بدستور لڑ رہے ہیں۔ اس پر لڑکے نے پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کہا "شیراز سے"۔ پوچھا۔ کیا آپ کو سعدی کا کوئی کلام یاد ہے؟ محمد خوارزم کا زمانہ سلطنت ۵۹۶ھ۔ ۶۱۷ھ = ۱۱۹۹ء۔ ۱۲۲۰ء تھا۔ اور تا تاریوں سے اس کی جنگیں ۶۱۴ھ ۶۱۷ھ (۱۲۱۷ء۔ ۱۲۲۰ء) تک رہیں۔ صلح بھی اسی عرصے میں ہوئی ہوگی۔ اس وقت سعدی کی شہرت شیراز سے کاشغر (پندرہ سو میل دور) تک پھیل چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ۶۱۴ھ میں سعدی کی عمر کیا تھی؟ اگر تاریخ ولادت ۶۰۳ھ ہو تو گیارہ، ۶۰۶ھ ہو تو آٹھ سال بنتی ہے۔ آٹھ اور گیارہ برس کے بچے کو کیا خبر کہ شاعری کیا ہوتی ہے؟

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ ۶۱۴ھ میں سعدی کافی عمر کا ہوگا۔ ورنہ اس کی شہرت کاشغر تک نہ پہنچ سکتی۔ اس لیے پروفیسر آربری کی درج کردہ تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

تعلیم

جب سعدی پڑھنے کے قابل ہوا تو اس کے والد عبداللہ اسے اپنے مرشد حضرت مصلح الدین کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا "عبداللہ! مبارک ہو کہ اللہ نے تمہیں ایک روشن ضمیر بچہ عطا کیا ہے۔" اس کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر سعدی کے لیے دعا کی اور فرمایا کہ اسے ہر روز میرے پاس بھیجا کرو۔ ان کے فیض سے سعدی نے ابھی قرآن ہی حفظ کیا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ سعدی مہینوں ملول رہے اور بعد ازاں اپنے استاد و مرشد کا نام اپنے نام کا جزو بنالیا۔ اب سعدی کا پورا نام یوں ہے۔ شیخ مشرف الدین مصلح الدین سعدی بن عبداللہ بن مشرف الدین شیرازی۔

1۔ زید نے عمرو کو مارا

2۔ سلاطین اسلام ترجمہ ڈاکٹر بزن "خوارزمشاہیاں"

حفظ قرآن کے بعد سعدی نے اپنے والد سے صرف ونحو، فقہ و حدیث کی چند ابتدائی کتابیں اور تفسیر پڑھی۔ چونکہ شیراز میں اعلیٰ علوم کی سہولتیں موجود نہ تھیں۔ اس لیے سعدی بغداد کے متعلق سوچنے لگا۔

سعدی کا بچپن اور شباب

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں۔ عبداللہ ایک بلند پایہ صوفی تھے۔ سماع و حال کے گرویدہ۔ جب سعدی پانچ چھ سال کا ہوا تو اپنے والد کے ہمراہ سماع کی محفلوں میں شامل ہونے لگا۔ ساتھ ہی وہ مشاعروں اور مباحثوں میں بھی شرکت کرتا۔ عبداللہ کو کبھی کبھی بادشاہ کی دعوت پہ دربار میں بھی جانا پڑتا۔ اور سعدی عموماً ساتھ ہوتا۔ اس طرح سعدی صحبت مشائخ اور دربار سلاطین کے تمام آداب سیکھ گیا اور جوانی ہی میں اس کی ذہانت، دانش، سلیقہ مندی اور پرہیز گاری کی شہرت ہر طرف پھیل گئی۔

پہلا حج

حضرت مصلح الدین کی وفات کے معاً بعد عبداللہ نے حج کا ارادہ کیا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ سعدی بھی ساتھ جانے پہ مصر تھا۔ دس گیارہ سال کا بچہ ہزاروں میل کا پیدل سفر، قیامت کی گرمی۔ وسیع و عریض ریگستان اور قدم قدم پہ راہزنوں کا خطرہ والدین اور دیگر احباب و اقارب نے سعدی کو روکنے کے لیے ہزار جتن کیے۔ لیکن وہ نہ مانا۔ مجبوراً عبداللہ نے اپنی اہلیہ فاطمہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ تاکہ وہ سفر میں بیٹے کا خیال رکھے۔ کوچ کے دن سعدی نے کمر باندھی۔ ایک چھوٹی سی تلوار جوا سے ایک شہزادے نے دی تھی زیب کمر کی۔ کمان ہاتھ میں لی۔ ترکش کندھے پہ ڈالا اور تکبیرات پڑھتے ہوئے قافلے کے ساتھ ہو لیا۔ اس طویل سفر میں اس نے کوئی نماز ترک نہ کی، نہ تلاوت چھوڑی۔ دو چار دن کے بعد نماز تہجد (سحر) بھی شروع کر دی اور تادم مرگ اس کا پابند رہا۔

اس قافلے کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ تھا۔ جب چاندنی راتوں میں گھوڑوں اور اونٹوں کی قطاریں ٹیلوں کا چکر کاٹتیں سارے حدی خوان مل کر بیٹھے اور مست گیت

گاتے، نقیب ہوشیار و بیدار باش کی آوازیں لگاتے اور چاؤش گھوڑوں کو نچاتے۔ نیزے ہوا میں گھماتے اور جوش انگیز نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھتے۔ تو سعدی جھوم جھوم کر تکبیریں پڑھتا۔ اور سفر کی تمام صعوبتیں بھول جاتا ایک مرتبہ سعدی اونٹ سے گر پڑا۔ اور خاصی چوٹ آئی۔ لیکن فوراً اٹھا۔ اور کپڑے جھاڑ کر تیز تیز چلنے لگا کہ کہیں والد کو یہ کہنے کا موقع نہ مل جائے۔ کہ بیٹا! اسی لیے تو میں تم کو اس سفر سے روکتا تھا۔

سعدی کی آواز بڑی رسیلی تھی۔ جب نماز صبح کے بعد وہ بلند آواز سے تلاوت کرتا تو قافلہ کے تمام مرد و زن اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اسے دعائیں دیتے۔

بعد از حج

یہ قافلہ بخیر و عافیت منزل پہ پہنچا۔ ارکان حج ادا کیے۔ کچھ عرصہ تک حرمین میں ٹھہرے۔ پھر واپس چل دیے اور اندازاً پانچ چھ ماہ کے بعد بخیر و عافیت وطن کو لوٹ آئے۔

عبداللہ کا انتقال

چند روز بعد عبداللہ پہ دل دھڑکن کا حملہ ہوا۔ اور وہ سعدی کو تنہا چھوڑ کر اگلی دنیا کو روانہ ہو گئے۔ اس وقت سعدی کی عمر گیارہ برس تھی۔

ع مرا باشد از درد طفلاں خبر
که در طفلی از سر گذشتم پدر
من آنکه سر تا جور داشتم
که سر در کنار پدر داشتم (بوستان)

ترجمہ: یتیموں کے دکھ کو مجھ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔
کہ میں بچپن میں باپ کے سایہ سے محروم ہو گیا تھا۔
جب تک میرا سر باپ کی آغوش میں رہا۔
میں اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتا تھا۔

عزمِ بغداد

شیراز میں کام کا کالج ایک ہی تھا جو دارالعلوم عضدیہ[1] کے نام سے مشہور تھا۔ اور باقی تمام چھوٹے چھوٹے مدارس تھے۔ اس کالج میں علم نجوم، ریاضی اور طبیعیات کی تعلیم نہیں ہوتی تھی۔ اور سعدی ان علوم کا بہت شائق تھا۔ ہر چند کہ وہ بغداد کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ لیکن والدہ کی جدائی اسے شاق گزرتی تھی۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی حلب کے ایک ایوبی فرمانروا غیاث الدین محمد (مشہور صلاح الدین کا پوتا۔ سلطنت ۶۱۳ھ۔ ۶۳۴ھ = ۱۲۱۶ء۔ ۱۲۳۶ء) نے شیراز پر حملہ کر کے اس کالج کی عمارت گرا دی۔ اور اس کے کچھ اساتذہ کو قتل کر ڈالا۔ تو سعدی کے لیے سفر بغداد ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ وہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ہو لیا۔ کبھی پیدل چلتا اور کبھی قافلے والے اسے خچر وغیرہ پر بٹھا لیتے۔ لیکن پہلی ہی منزل پہ سعدی کو تپ نے آلیا۔ اور قافلے کا ساتھ چھوٹ گیا۔ ایک رحم دل عورت اسے گھر لے گئی۔ علاج کرایا۔ بڑی محبت سے اس کی تیمار داری کی اور گیارہ دن کے بعد اس کا بخار ٹوٹ گیا۔

چند روز کے بعد سعدی نے اپنی میزبان سے اجازت مانگی۔ چونکہ ان دو ہفتوں میں سارا گاؤں سعدی کا گرویدہ بن چکا تھا۔ اور ہر شخص اس کی متانت، شرافت، علمیت شگفتہ صحبت اور دلچسپ گفتگو کا مداح تھا۔ اس لیے اسے الوداع کہنے کے لیے تمام آبادی اکٹھی ہو گئی۔ کوئی کباب پیش کر رہا تھا۔ کوئی شہد اور کوئی پنیر۔ سعدی نے ان سب کی محبت کا شکریہ ادا کیا۔ اور باچشم تر روانہ ہو گیا۔ لوگ دیر تک اسے دیکھتے رہے اور آنسو بہاتے رہے۔

سعدی کا سامان سفر ایک سنہری قرآن شریف، چند کتابیں ایک کمان، ایک ترکش اور ایک تلوار تھی۔ راہ پر خطر تھا۔ اور ہر قدم پر راہزنوں کا اندیشہ۔ ابھی سعدی تین چار فرسنگ ہی گیا ہوگا کہ سامنے ایک پہاڑی سے چند آدمی نکلے۔ سرخ آنکھیں بڑی بڑی مونچھیں اور خوفناک خدوخال۔ سعدی کے قریب آئے اور گرج کر کہا۔ تمہارے پاس جو کچھ ہے ہمارے حوالے کرو۔ سعدی نے

---

[1] اس کی بنا عضد الدولہ ابوشجاع خسرو نے ڈالی تھی۔ جو آلِ بُویہ کا دوسرا فرماں روا تھا۔ اس کا پایہ تخت شیراز تھا اور زمانہ سلطنت ۳۳۸ھ۔ ۳۷۲ھ۔ ۹۴۹ء۔ ۹۸۲ء تھا۔

اپنی جیب سے چند دینار نکال کر سامنے رکھ دیے اور کہا میں ایک طالب علم ہوں۔ بغداد جا رہا ہوں۔ یہ رقم وہاں کتابیں خریدنے اور دیگر ضروریات کے لیے تھی۔ اب چونکہ تم اس کے مالک بن چکے ہو۔ اس لیے میں اتنی سی درخواست کرتا ہوں کہ یہ رقم اپنے بچوں کی دینی تعلیم پر خرچ کرنا۔

سعدی کی اس بات اور دیگر علامات نجابت و شرافت سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان میں سے دو قزاقی سے تائب ہو گئے اور سعدی کی حفاظت و خدمت کے لیے اس کے ساتھ چل پڑے۔ ان کے پاس ایک عمدہ گھوڑا بھی تھا۔ جس پر کبھی سعدی سوار ہوتا۔ اور کبھی وہ۔ یہ دونوں سعدی کی باتیں اور حکایتیں بڑے شوق سے سنتے اور اسے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچاتے تھے۔

قضارا ایک دن اس زور کا طوفان اٹھا۔ کہ فضا تاریک ہو گئی بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ اور یہ تینوں ایک کھوہ میں جا گھسے۔ ظہر کا وقت تھا۔ سعدی نے پہلے نماز پڑھی۔ اور پھر قرآن کھول لیا۔ یکایک اس کے ایک دوست کے منہ سے چیخ نکلی۔ اور وہ زمین پر تڑپنے لگا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک ناگ پھنکارتے ہوئے جا رہا ہے۔ مارگزیدہ چند لمحوں میں مر گیا۔ معاً۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے پھٹ گیا۔ اور اس سے نیلا پانی بہنے لگا۔ وہ دونوں اس منظر سے گھبرا گئے اور قریب ہی ایک درخت پہ چڑھ گئے۔ وہ لاش ان کے سامنے تھی۔ آناً فاناً وہ پہلے پھولی۔ اور پھر پھٹ گئی سعدی نے ساتھی سے پوچھا۔ یہ شخص دراصل کون اور کیا تھا؟ کہنے لگا۔ یہ ایک نہایت بدچلن نوجوان تھا۔ اس کا باپ اصفہان کا سب سے بڑا قاضی تھا۔ اس نے باپ کو قتل کر کے تمام نقدی ہتھیا لی۔ اور عیاشی و بدمعاشی کے لیے ایشیائے کوچک کے بڑے بڑے شہروں میں گھومتا رہا۔ جب وہ رقم ختم ہو گئی تو قزاق بن گیا۔ یہ اب تک سو سے زیادہ قافلوں کو لوٹ چکا ہے۔ اور اتنے ہی بے گناہوں کا قاتل ہے۔ سعدی نے آہ بھر کر کہا۔ کہ اللہ بہت بڑا منتقم ہے۔ اور کوئی بدکار پاداش گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ یہ جملہ سن کر خوف سے اس کے ساتھی کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا بدن کانپنے لگا۔ اور سعدی سے پوچھنے لگا۔ اے سعدی! میرا نامۂ اعمال بھی نہایت تاریک ہے نہ جانے میرا انجام کیا ہو گا۔ یہ جملہ ختم ہی ہوا تھا۔ کہ درخت کا وہ ٹہنا کہ جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ تڑاخ سے ٹوٹا۔ وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اور اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اب وہ شدت درد سے چیخ رہا تھا اور بار

بار کہتا۔ سعدی! اللہ کے لیے میرا سر کسی بھاری پتھر سے کچل ڈالو۔ تا کہ اس عذاب سے چھوٹ جاؤں۔ سعدی درخت سے اتر کر ادھر ادھر کسی آدمی کی تلاش میں نکلا۔ کوئی نہ ملا۔ تو واپس آیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چند بھیڑیئے اس کے جسم کے ٹکڑے منہ میں لیے ادھر ادھر بھاگے جا رہے تھے۔ سعدی دیر تک ان سبق آموز واقعات پہ غور کرتا رہا۔ اور جب طوفان تھم گیا۔ تو گھوڑے پر سوار ہو کر تنہا منزل کی طرف چل دیا۔ اور کچھ عرصے کے بعد بغداد جا پہنچا۔

بغداد کب پہنچا؟

مرزا حیرت اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

''ابھی بیس برس کی عمر سعدی کی نہ ہوئی ہوگی۔ کہ وہ عربی کی صرف و نحو میں کامل ہو گیا۔ اور عربی ادب کی کتابیں وہ بخوبی پڑھنے لگا.......... گو سعدی چھپ چھپا کر طبیعیات، علم نجوم اور ہیئت کی کتابیں دیکھتا رہتا تھا۔ مگر بغیر استاد یہ علم از خود نہیں آتے۔ سعدی سوچتا تھا۔ کہ میں کہاں جاؤں اور کیونکر تعلیم حاصل کروں۔ خیال کرتے کرتے اسے بغداد[1] کی علمی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔

(سوانح عمری سعدی ص ۴۵)

اس اقتباس سے تاثر یہ ہوتا ہے کہ سعدی نے یہ سفر اکیس بائیس برس کی عمر میں کیا ہوگا اب ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

''ایک کتاب اس وقت میرے آگے میز پر رکھی ہے۔ یہ سعدی کی تصنیف ہے۔ آٹھ جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ یہ دراصل ایک تاریخ ہے جس میں سعدی نے عباسیہ حکومت کا چھ سو برس کا فوٹو کھینچا ہے........... ہم کچھ حال اس کی کتاب میں سے نقل کرتے ہیں۔ جس میں اس نے معتصم باللہ کی شوکت و تباہی کا حال لکھا ہے۔ سعدی کہتا ہے:۔

---

1. دہلوی ہونے کے باوجود مرزا صاحب کی اردو از بس ناقص ہے۔

''بغداد میں قدم رکھتے ہی پہلی نظر خلیفہ معتصم باللہ کے عظیم الشان محل پر پڑی۔ جس پر ہلالی پھریرہ فرفر ہوا میں فراٹے بھر رہا تھا............شہر میں داخل ہونے پر تو اور ہی کیفیت نظر آئی۔ تجارت کی گرم بازاری، جوہریوں کی دوکانوں میں کروڑہا روپیہ کے جواہرات، بلوری، چینی اور سنہری برتنوں کے سوداگروں کی دوکانوں میں کثرت ۔۔۔۔ ہر شخص زرق برق، پل شل پیل پیکر گھوڑوں پہ جاتا تھا۔ آبادی کی وہ کثرت کہ چلنا مشکل، مسجدوں اور خانقاہوں کی کثرت۔

میں نے بغداد میں داخل ہوتے نیا سماں یہ دیکھا کہ لوگ برآمدوں اور کوٹھوں پر ہزار ہا روپیہ کا زیور پہنے اور قیمتی پوشاکیں زیب تن کیے بیٹھے ہیں چہچہے اڑ رہے ہیں۔ عطر ملا جا رہا ہے۔ کوئی گاتا ہے اور کوئی قہقہے لگاتا ہے۔ ....سڑکوں پر گلابِ رُومی اور کیوڑے کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے.........معلوم ہوا کہ شام کو خلیفہ معتصم باللہ کی سواری نکلے گی۔

اب مجھے یہ فکر ہوا کہ میں کہاں جاؤں۔ اور کس جگہ کھڑے ہو کر خلیفہ کو ملاحظہ کروں۔ میں اسی خیال میں تھا کہ میرا ایک دوست مل گیا۔ مجھے وہ اپنے مکان میں لے گیا۔ جہاں خلیفہ کی سواری کا نظارہ میں نے بخوبی کر لیا۔ خلیفہ کے آگے کثرت سے امرا تھے۔ جن کے کپڑے جھم جھم کر رہے تھے۔ ہر شخص کا سامان لاکھوں کا تھا.........خلیفہ کے پیچھے دس ہزار سوار کالے گھوڑوں پر سوار تھے۔'' (ص ۷۰)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ سعدی معتصم کے زمانے میں بغداد پہنچا تھا۔ معتصم خاندان عباسیہ کا آخری خلیفہ تھا۔ جو ۶۴۰ھ = ۱۲۴۲ء میں تخت نشین ہوا اور ۶۵۶ھ = ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

اگر مرزا حیرت کا یہ بیان کہ سعدی بغداد میں سات برس رہا۔ اور بعض تذکرہ نگاروں کی

رائے کہ تباہی بغداد کا منظر سعدی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ درست سمجھی جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ سعدی بغداد میں ۶۴۸ھ = ۱۲۵۰ء کے اواخر میں پہنچا تھا۔ کیونکہ بغداد کی تباہی ۶۵۶ھ = ۱۲۵۸ء میں ہوئی تھی اور اس وقت سعدی کی عمر ۴۵ برس تھی۔

باقی تفاصیل

سعدی جب بغداد کے مضافات میں پہنچا۔ تو رات کو ایک سرائے میں اترا۔ جو دریائے دجلہ کے غربی کنارے پہ تھی۔ صبح کو کشتی میں بیٹھ کر دوسرے کنارے پر پہنچا۔ اپنے گھوڑے پہ سوار ہو کر بغداد کی شاہراہوں پہ جا رہا تھا کہ پیچھے سے اسے کسی نے بلایا۔ یہ تھے شیراز کے ایک فاضل سلطان الدین احمد، جو مدرسۂ نظامیہ میں پروفیسر تھے۔ سعدی انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ فوراً گھوڑے سے اتر کر بغل گیر ہو گیا۔ مولانا سلطان سعدی کو ساتھ لے گئے۔ دو تین دن کے بعد مدرسۂ نظامیہ میں داخل کرا دیا۔ اور ساتھ ماہانہ وظیفے کا بھی انتظام کر دیا۔

مدرسۂ نظامیہ

مدرسۂ نظامیہ کی عمارت نہایت پرشکوہ تھی۔ اس میں اتنے کمرے تھے کہ وہ ایک پورا شہر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہال میں دس ہزار آدمی سما سکتے تھے۔ دیواروں پہ سنہری نقوش تھے۔ اور نیچے قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے طلبہ کی تعداد سات ہزار تھی۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ یہاں منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور دیگر علوم حکمی کی تدریس کا پورا انتظام موجود تھا۔ تیراندازی، تیغ بازی اور گھوڑے کی سواری کی بھی مشق کرائی جاتی تھی۔ کالج میں کئی جماعتیں تھیں۔ اور ہر جماعت کا لباس دوسری سے جدا تھا۔ ایک شعبہ اجنبی زبانوں کا تھا۔ جہاں لاطینی، عبرانی، یونانی، سنسکرت اور فارسی سیکھنے کا مکمل انتظام تھا۔ سعدی نے یہ تمام زبانیں سیکھیں۔ اور بقول مرزا حیرت یونان کے مشہور شاعر ہومر کے کلام پہ کچھ حواشی[1] بھی لکھے۔ جب سعدی طویل سیاحت کے بعد وطن کو لوٹا۔ تو وہ چھبیس زبانیں جانتا تھا۔

---

[1] یہ حواشی اب کہاں ہیں؟ مرزا صاحب نے کچھ نہیں بتایا۔

تصانیف سعدی

عام تذکروں میں سعدی کی ان تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔(۱) گلستان (۲) بوستان (۳) کریما[1] (۴) قصائد عربی و فارسی (۵) غزلیات کے تین دیوان (۶) قطعات و رباعیات کا مجموعہ۔ لیکن مرزا حیرت نے چند اور تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن سے باقی تذکرہ نگار نا آشنا ہیں۔ مثلاً

۱۔ تاریخ عباسیہ یا تاریخ بغداد۔ آٹھ جلدیں۔

۲۔ جزائر افریقہ۔ چار جلدیں۔

۳۔ کتاب ہیئت۔ جس میں افلاک و نجوم پہ بحث ہے۔

۴۔ تصوف میں چند رسائل۔

مرزا حیرت لکھتے ہیں:۔

"شیخ علی بن احمد بن ابی بکر نے سعدی کی وفات سے بیالیس برس بعد چند چھوٹی چھوٹی کتابیں ایک جگہ جمع کیں۔ اور حکمت یہ کی کہ جو کتابیں سعدی کے نام سے مشہور نہیں ہوئی تھیں۔ اپنے نام کر لیں۔ اور جو بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ ان کو سعدی کا کلیات بنا دیا۔" (ص ۷۷)

اسی صفحہ پر یہ بھی لکھا ہے:۔

"جہاں تک تحقیق ہوا ہے سعدی کی تصانیف ڈیڑھ سو گنی گئی ہیں۔"

اوپر کے الزام اور اس دعوٰی میں صداقت کتنی ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر مرزا صاحب ماخذ کا حوالہ دے دیتے۔ تو یہ الجھن پیدا نہ ہوتی۔

سیاحت

سعدی بغداد سے کس سال نکلے؟ اور کہاں کہاں گئے؟ ہمیں معلوم نہیں۔ مرزا حیرت کہتے ہیں کہ قیام بغداد کے دوران میں سعدی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (م۔ ۱۲۳۴ء) کی خدمت میں عموماً جاتے بلکہ ایک روایت کے مطابق ان کے ہاتھ پہ بیعت بھی کر لی تھی۔ جب ان

[1] بعض ناقدین کی رائے یہ ہے کہ کریما کا مصنف ہندوستان کا ایک شاعر تھا جو سعدی تخلص کیا کرتا تھا۔

کے مرشد نے ارادۂ حج کیا۔ اور سعدی کو اشارہ فرمایا۔ تو وہ بھی تیار ہو گئے۔ اس قافلہ نے بحری راستہ اختیار کیا۔ ایک شام انھیں طوفان نے آلیا۔ کشتی نا خداؤں کے اختیار سے باہر ہو گئی۔ اور سمندر کی لہریں کبھی اسے میلوں جنوب میں اور کبھی مغرب کی طرف دھکیل کر لے جاتیں۔ اس حالت میں کوئی رو رہا تھا۔ اور کوئی سجدے میں گر کر اللہ کو پکار رہا تھا۔ اک رستخیز کا عالم تھا۔ لیکن شیخ شہاب الدین نہایت سکون و اطمینان سے مصروف ذکر تھے۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔ اے لوگو! تم یہ کیا حرکتیں کر رہے ہو۔ موت کا وقت معین ہے۔ اگر آج وہ وقت آ گیا ہے۔ تو پھر تم بچ نہیں سکتے اور اگر نہیں آیا۔ تو یہ طوفان تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔

اس لئے

سکونِ دل سے خدا کر
جو ہو رہا ہے، وہ ہو چکے گا (اقبالؒ)

قافلہ بخیر و عافیت منزل پہ جا پہنچا۔ حج کیا۔ اور واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سعدی نے مرشد سے اجازت مانگی۔ اور ایک قافلے کے ساتھ مصر چلا گیا۔ وہاں ڈیڑھ برس رہا۔ وہاں سے شام کا رخ کیا۔ اور اس کے بعد کہاں کہاں گیا۔ کچھ معلوم نہیں۔

گلستان و بوستان کی روشنی میں

سعدی کس عمر میں گھر سے نکلا؟ پہلے کہاں گیا؟ کس راہ سے گیا؟ کہاں کہاں کتنا قیام کیا؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب تا حال نہیں مل سکا۔ چونکہ اتنا طویل سفر کرنے کے لیے صحت اور جوانی کی ضرورت ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ تمام سفر اس نے جوانی میں کیے ہوں گے۔ خود ہی لکھتے ہیں:

روزے بغرور جوانی سخت رانده بودم (گلستان باب ششم)

چونکہ سعدی نے بوستان ۶۵۵ھ = ۱۲۵۷ء اور گلستان ۶۵۶ھ = ۱۲۵۸ء میں لکھی تھی اور ان کتابوں میں ایشیائے خورد حبشہ، کاشغر، شام، فلسطین، ہندوستان اور خلیج فارس وغیرہ کا ذکر ملتا

ہے۔اس لیے یہ یقینی امر ہے کہ سعدی نے یہ سیاحت ان کتابوں کی تکمیل سے پہلے کی ہوگی۔میرا خیال یہ ہے کہ سعدی جہاں جاتا تھا کسی مکتب یا مسجد میں ہفتوں اور مہینوں رہتا تھا۔اور جب اکتا جاتا تھا تو آگے چل دیتا تھا۔وہ وعظ بھی کیا کرتا تھا۔

وقتے در جامع بعلبک کلمۂ چند ہمی گفتم بطریق وعظ (گلستان باب دوم)

بعلبک شام کا ایک شہر ہے۔یہ شام کے دیگر بلاد مثلاً دمشق، حلب، حمص، طرابلس وغیرہ میں بھی گھومتا رہا۔

از صحبت یاران دمشقم ملالتے پدید آمدہ بود سر در بیابان قدس نہادم اسیر فرنگ شدم ....در خندق طرابلس مرا با جہوداں بکار گل داشتند

(گلستان باب دوم)

کوفہ و بصرہ کی بھی سیر کی۔

اعرابیے را دیدم در حلقۂ جوہریان بصرہ (گلستان باب سوم)

پیادۂ سر و پا برہنہ با کاروانِ حجاز از کوفہ بدر آمد و ہمراہ ماشد (گلستان باب دوم)

کئی مرتبہ بیابان مکہ کو طے کیا۔

شبے در بیابان مکہ از بے خوابی پائے رفتم بماند (گلستان باب دوم)

ایک دفعہ خلیج فارس کے ایک جزیرے کیش یا کِش میں جا نکلا۔

بازرگانے در جزیرۂ کیش مرا بہ حجرۂ خویش بُرد (گلستان باب سوم)

۶۱۴ھ = ۱۲۱۷ء میں وہ چینی ترکستان کے ایک شہر کاشغر میں پہنچا۔

سالے کہ محمد خوارزم شاہ با ختا برائے مصلحتے صلح اختیار کرد بجامع کاشغر در آمدم۔(گلستان باب پنجم)

ایک مرتبہ یمن کے پایۂ تخت صنعاء میں عیال سمیت جا نکلا۔اور وہاں اس کا ایک بچہ فوت ہوا۔

بہ صنعاء درم طفلے اندر گزشت
چہ گویم کزانم چہ برسر گزشت (بوستان)

اشعار ذیل میں شام، روم، حبشہ، مصر اور ہند جانے کا ذکر ملتا ہے:۔

۱۔ غریب آمدم در سوادِ حبش

۲۔ غلامے بہ مصر اندرم بندہ بود

۳۔ بتے دیدم از عاج در سومنات

۴۔ تو لاے مردان ایں پاک بوم

برانگیختم خاطر از شام و روم

سیاحت سعدی کی تصویر یوں بنتی ہے۔ کہ وہ جوانی کے عالم میں شیراز سے نکلا۔ جہاں کہیں کسی عالم یا ولی کا شہرہ سنا۔ وہاں جا پہنچا۔ راہ میں ہر منزل اور ہر بستی میں وعظ کہتا گیا۔ وہ غالباً دو مرتبہ بغداد گیا۔ پہلی دفعہ حضرت شہاب الدین سہروردی (م ۱۲۳۴ء) کی زندگی میں۔ اور دوسری دفعہ کئی سال بعد مستعصم کے عہد میں۔ ممکن ہے کہ سعدی نے نظامیہ میں داخلہ دوسری بار لیا ہو۔ یا دونوں مرتبہ داخل ہوا ہو۔

غالباً بغداد سے سعدی سیدھا وطن کو لوٹا اور ۱۲۶۰ء کے قریب شیراز جا پہنچا۔

آخری ایام

اواخر عمر میں اس نے شیراز سے باہر ایک کٹیا بنالی۔ جس میں بیٹھ کر وہ عبادت کیا کرتا تھا۔ بالآخر آسمانی بلندیوں سے پیام حضوری آ ہی گیا۔ اور ایشیا کا وہ عظیم دانش ور، جس کا کلام گزشتہ سات سو برس سے دلوں کو گرما رہا ہے۔ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا آپ کی وفات ۶۹۱ھ = ۱۲۹۲ء میں ہوئی۔ اور اپنی کٹیا میں دفن ہوئے۔ ان کا مزار سعدیہ کہلاتا ہے۔ شیراز کے لوگ ہفتہ میں ایک دن وہاں جاتے اور اس کی مطمئن روح کو عبادت و تلاوت کا ثواب پہنچاتے ہیں۔ کسی نے کیا اچھی تاریخ وفات کہی ہے:۔

ع ز خاصاں بود زاں تاریخ شد خاص

(کہ سعدی اللہ کے خاص بندوں میں سے تھا۔ اسی لیے اس کی تاریخ وفات بھی "خاص" ٹھہری)

خاص۔ میں تین حروف ہیں۔ ان کا مجموعۂ اعداد ۶۹۱ بنتا ہے۔

خ=۶۰۰، ا=۱، ص=۹۰ =۶۹۱ھ

آؤ ہم سب مل کر دعا کریں۔ کہ اللہ اسلام کے اس فرزند جلیل کو فردوس کی فضاؤں میں مقام بلند عطا فرمائے اور ہماری روحوں کو وہی سوز دے جو سعدی کی زندگی کا ساز تھا۔

خودی کے ساز میں ہے عمر جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
یہ ایک بات، کہ آدم ہے صاحب مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ (اقبالؒ)

حکایات بوستان وگلستان

بوستان کا سال تصنیف ہے ۶۵۵ھ = ۱۲۵۷ء اور گلستان کا ۶۵۶ھ = ۱۲۵۸ء۔ گلستان میں آٹھ باب ہیں اور بوستان میں نو۔ صرف تین باب مشترک ہیں یعنی تربیت، قناعت اور عشق۔ جن پر دونوں کتابوں میں جدا جدا حکایات ہیں۔ باقی ابواب کے عنوان مختلف ہیں۔

لیجئے! اب ہر عنوان کے تحت کچھ حکایات سنیے:۔

باب اول

بادشاہوں کی سیرت

(۱) نوجوان راہزن

چندراہزن قافلوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے فوج کا ایک دستہ بھیجا۔ جو انھیں گرفتار کرلایا۔ بادشاہ نے سب کو موت کی سزا دے دی۔ ایک ڈاکو ۱۶۔۱۷ برس کا نوجوان تھا۔ وزیر کو اس کی جوانی پر رحم آیا۔ اور بادشاہ سے درگزر کی سفارش کی۔ بادشاہ نے کہا:۔

آتش کشتن و اخگر گزاشتن افعی کشتن و بچہ اش را نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست۔

کہ آگ بجھانا اور چنگاری کو چھوڑنا
سانپ کو مارنا اور اس کے بچے کو پالنا دانش نہیں

چند درباری بھی وزیر کے ہم نوا بن گئے اور کہنے لگے۔ اے آقائے نعمت! ابھی اس نوجوان کی فطرت میں بدی راسخ نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ صحبت صالح سے یہ سنور جائے۔ بادشاہ نے بادل ناخواستہ اسے چھوڑ دیا اور فرمایا:۔

بخشیدم[1] اگرچہ مصلحت ندیدیم

وزیر اس لڑکے کو گھر لے گیا۔ کئی استاد اس کی تعلیم و تربیت پہ لگا دیئے۔ اور رفتہ رفتہ وہ نہایت شائستہ و مہذب بن گیا۔ ایک مرتبہ وزیر نے بادشاہ کے سامنے اس کا ذکر کیا۔ تو بادشاہ نے سر ہلایا اور فرمایا:۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود
گرچہ با آدمی بزرگ شود

کہ بھیڑیے کا بچہ، خواہ وہ انسانوں میں پلے، آخر میں بھیڑیا ہی بنتا ہے۔

---

[1] ترجمہ: گو خلاف مصلحت ہے لیکن معاف کرتا ہوں۔

تین چار برس کے بعد نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات کو اٹھا وزیر اور اس کے بچوں کو قتل کیا۔ اور سب کچھ سمیٹ کر دوبارہ راہزنوں میں جا ملا۔ بادشاہ کو خبر ملی تو ایک سرد آہ لی اور فرمایا:۔

زمین شور سنبل نیارد   درد تخم عمل ضائع مگرداں
نکوئی با بداں کردن چنانست   کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

زمین شور میں سنبل نہیں ہوگا۔
اس میں محنت و کوشش کا کیا فائدہ۔
بروں سے نیکی ایسی ہی ہے۔
جیسے نیکوں سے بدی کرنا۔

۲۔ سرہنگ زادہ

ایک کوتوال زادہ اپنے فہم و فراست کی وجہ سے سلطان کا منظور نظر بن گیا کسی نے درست کہا ہے کہ

تو نگری بہ دل است نہ بمال   و بزرگی بہ عقل است نہ بسال[1]
تو نگری دل سے ہے نہ کہ مال سے   اور بڑائی عقل سے ہے نہ کہ ماہ و سال (عمر) سے

اہل دربار جل اٹھے۔ اور اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک دن بادشاہ نے پوچھا۔ کہ یہ لوگ تم سے کیوں خفا ہیں؟ کہا حضور! جب سے سایۂ دولت میں آیا ہوں ہر شخص سے تعلقات مہر و محبت بڑھائے ہیں۔ لیکن حاسدوں کو میں خوش نہ کر سکا۔ کہ ان کی مسرت میری ذلت و مصیبت میں نہاں ہے۔

---

[1] (لطیفہ) ضلع اٹک میں ایک گاؤں کا نام بسال ہے جو میرا مولد و مسکن ہے میرے ایک نہایت مخلص و بے تکلف دوست جب کسی علمی بحث میں کوئی راہ گریز نہیں پاتے تو ''اوچھے'' ہتھیاروں پہ اتر آتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کے لیے عقل چاہیے اور آپ کے متعلق تو چچا سعدی سات سو سال پہلے کہہ گیا تھا ''بزرگی بہ عقل است نہ بسال'' (برق)

توانم اینکہ نیازارم اندرونِ کسے
حسود راچہ کنم کو زخود بہ رنج دراست
بمیر تا برہی اے حسود کیں رنجیست
کہ از مشقت اوجز بمرگ نتواں رست
(میں یہ تو کرسکتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں۔ لیکن اس کم بخت حاسد کا کیا کروں جو خواہ مخواہ جل سڑ رہا ہے۔ مرتا ہے تو مرائے منحوس کہ حسد کا علاج صرف موت ہے)

۳۔ ایک ظالم بادشاہ

عجم کا ایک بادشاہ اس حد تک ظالم و سنگ دل تھا۔ کہ اس کی رعیت ہجرت پر مجبور ہو گئی۔ جب آبادی کم رہ گئی۔ اور خزانہ خالی ہو گیا تو اس کے دشمن ملک پر چڑھ آئے ایک مرتبہ اس کی مجلس میں شاہنامہ[۱] فردوسی سے ضحاک کو فریدوں کی کہانی پڑھ رہے تھے۔ وزیر نے بادشاہ سے پوچھا کہ

[۱] دربار غزنوی (سلطان محمود) کے مشہور شاعر فردوسی ملکوی ۹۴۰ء، ۲۵-۱۰۲۰ء نے شاہنامہ ۴۰۰ھ = ۱۰۱۰ء میں مکمل کیا تھا۔

[۲] ایران کی سیاسی تاریخ پشدادی خاندان سے چلتی ہے۔ یہ خاندان ولادتِ مسیح سے اندازاً تین ہزار سال پہلے حکمران تھا۔ ان لوگوں کی عمریں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ اس خاندان سے دس حکمران اڑھائی ہزار برس تک حکمران رہے۔ ان کے نام یہ تھے۔ کیمرث، ہوشنگ، طمورث، جمشید، ضحاک، فریدوں، منوچہر، نوذر، زو، گرشاسپ، حکومت ۳۴۴۱-۵۰۶ قم...... ان کے بعد کیانی آئے کل دس بادشاہ تھے۔ یعنی کیقباد، کیکاؤس، کیخسرو، لہراسپ، گشتاسپ، اسفندیار، بہمن، ہماد ختر بہمن، داراب، دارا، زمانہ حکومت از ۵۰۶ قم تا ۲۲۶ء...... کیانیوں کے بعد ساسانیوں کے اٹھائیس بادشاہ ۲۲۶ء سے ۶۵۲ء تک حکمران رہے۔ ان میں سے اُردشیر، شاپور، بہرام، نوشیرواں اور خسرو پرویز بہت مشہور ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۶۳۰ء میں اسی خسرو کو خط لکھا تھا۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ یزدجر (یزدگرد) تھا جس نے ۶۳۴ء سے ۶۵۲ء تک حکومت کی اور اس کے بعد ایران مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

ضحاک و فریدوں کی کہانی: کہتے ہیں کہ ضحاک کے کندھوں پر دو سانپ تھے۔ جن کی غذا انسانی مغز تھا اور اس مقصد کے لیے ہر روز دو انسان ذبح ہوتے تھے۔ دار الخلافہ میں ایک لوہار رہا کرتا تھا جس کا نام کاوہ تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ ایک لڑکا ان سانپوں کی غذا بن چکا تھا۔ جب کچھ عرصے کے بعد دوسرے کی باری آئی تو کاوہ غیض و غضب سے بھڑک اٹھا اور اپنی پھکنی کو علم بنا کر نعرۂ بغاوت بلند کر دیا۔ ساری رعیت ساتھ ہو گئی اور ضحاک قتل ہو گیا۔ اس وقت سے ایران کا قومی علم دُرفش کاویانی (دُرفش = علم، کاویانی = نسبت بہ کاوہ) کہلاتا ہے اور اس پر پھکنی کا نشان بنا ہوا ہے۔ ان لوگوں نے عرب کے ایک نہایت شریف اور رحمدل شاہزادے کو جس کا نام فریدوں تھا۔ اپنا بادشاہ بنا لیا۔)

فریدوں کے پاس نہ سپاہ تھی نہ خزانہ، وہ بادشاہ کیسے بن گیا۔ شاہ نے کہا۔ کہتے ہیں کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اور وہ جیت گیا۔ وزیر نے کہا۔ اے سلطان! جب لوگوں کا جمع ہونا سلطنت دلاتا ہے۔ تو پھر آپ انھیں بھگا کیوں رہے ہیں۔ کیا حکومت کا ارادہ نہیں؟ بادشاہ نے پوچھا کہ لوگ کیسے جمع ہو سکتے ہیں؟ کہا کہ رحم و کرم سے۔ اور آپ میں یہ دونوں صفات موجود نہیں۔

نہ کند جور پیشہ سلطانی ۔ کہ نیاید زگرگ چوپانی

(ظالم سلطان اور بھیڑیا چوپاں نہیں بن سکتا)

بادشاہ کو یہ مشورہ ناگوار گزرا اور وزیر کو زندان میں پھینک دیا۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کے عم زادوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ وہ تمام لوگ، جو ملک سے بھاگ گئے تھے، ان کے گرد جمع ہو گئے اور وہ ملک پہ قابض ہو گئے۔

غم زیردستاں بخور زینہار

بترس از زبردستی روزگار

(غریبوں کا غم کھاؤ اور زمانے کی بالادستی سے ڈرو)

۴۔ غلام اور کشتی

ایک بادشاہ ایک غلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا۔ چونکہ غلام نے پہلے کبھی دریا کا سفر نہیں کیا تھا۔ رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ اور کسی طرح چپ نہ ہوتا۔ اس کشتی میں ایک فلسفی بھی تھا۔ بادشاہ سے کہنے لگا۔ اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں اس کا علاج کروں۔ کہا میں اسے خاص لطف و کرم سمجھوں گا۔ فلسفی اٹھا۔ اور چند مسافروں کی مدد سے اسے دریا میں پھینک دیا۔ جب چار غوطے کھا چکا۔ تو بالوں سے گھسیٹ کر اسے دوبارہ کشتی میں بٹھا دیا۔ اب اس نے جان بچ جانے پر اللہ کا سو سو شکر ادا کیا۔ اور پھر آرام سے ایک گوشے میں جا کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ کہ اے فلسفی! اس میں کیا راز تھا؟ کہا ظلِ سبحانی!

قدر عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید

(امن و عافیت کی قیمت وہی جانتا ہے۔ جو کسی مصیبت میں پھنس جائے)

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراف[1]

از دوزخیاں پُرس کہ اعراف بہشت است

(حوروں کے لیے اعراف دوزخ ہے اور دوزخیوں کے لیے جنت)

۵۔ شاہ و پارسا

ایک ظالم بادشاہ نے ایک پارسا سے پوچھا۔ کہ کون سی عبادت سب سے اچھی ہے۔ کہا تمہارے لیے دن کی نیند۔ تاکہ دنیا تیرے ظلم سے کچھ دیر کے لیے تو بچی رہے۔

ظالمے راخفتہ دیدم نیم روز — گفتم ایں فتنہ است خوابش بردہ بہ

آنکہ خوابش بہتر از بیداری است — آنچناں بد زندگانی مُردہ بہ

(ایک ظالم کو میں نے دوپہر کے وقت سویا دیکھا۔ اور کہا۔ کہ یہ فتنہ ہے سویا رہے تو بہتر ہے۔ جس شخص کی نیند بیداری سے اچھی ہو۔ ایسا بدگو ہر مر جائے تو بہتر ہے)

۶۔ نکتہ

چار آدمی ان چار سے بھاگتے ہیں۔ راہزن سلطان سے، چور پاسبان سے، فاسق غماز سے اور زن فاحشہ کوتوال سے۔

آں را کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک۔

(جس کا حساب صاف ہو۔ اسے حساب گیروں سے کیا ڈر)

۷۔ کباب و نمک

کہتے ہیں کہ ایک شکارگاہ میں سپاہی انوشیرواں کے لیے کباب بنا رہے تھے۔ نمک نہ تھا۔ غلام کو دوڑایا۔ کہ گاؤں سے لے آئے۔ بادشاہ نے کہا۔ قیمت سے خرید۔ تاکہ بدنظمی نہ ہو۔ کسی نے کہا۔ چٹکی بھر نمک سے کیا خرابی ہو سکتی ہے۔ کہا کہ

---

[1] جنت سے کم تر ایک مقام

اگر زباغ رعیت ملک خورد سیبے
براورند غلامان او درخت از بیخ
بہ نیم بیضہ کہ سلطان ستم رواوارد
زنند لشکر یانش ہزار مرغ بہ سیخ

(اگر بادشاہ رعیت کے باغ سے ایک سیب توڑ لے۔ تو اس کے ملازم درخت کو بیخ سے نکال لیں گے۔ اور اگر وہ آدھا انڈا مفت کھالے تو اس کے سپاہی ہزار مرغ سیخ پہ چڑھا دیں گے)

۸۔ مردم آزار

ایک ظالم نے ایک غریب کے سر پہ پتھر کھینچ مارا۔ غریب میں ہمت انتقام نہ تھی۔ خاموش ہو گیا۔ اور پتھر پاس رکھ لیا۔ کچھ مدت کے بعد اس ظالم کو بادشاہ نے چاہ میں ڈال دیا۔ وہ غریب وہاں پہنچا۔ اور وہی پتھر اس کے سر پہ دے مارا۔ ظالم نے پوچھا۔ تم کون ہو۔ کیا میں فلاں ہوں۔ اور یہ وہی پتھر ہے۔ جو فلاں روز تم نے میرے سر پہ مارا تھا۔ کہا اتنی مدت کہاں رہے۔

گفت از جاہت اندیشہ می کردم۔ اکنوں کہ در چاہت دیدم۔ فرصت غنیمت شمردم

(جواب دیا کہ میں تمہارے جاہ سے ڈرتا تھا۔ اب تمہیں چاہ میں دیکھا تو موقعہ کو غنیمت سمجھا)

۹۔ علاج مرض

ایک بادشاہ بیمار ہو گیا۔ اس کے طبیبوں نے کہا کہ اس مرض کی دوا ایک ایسے آدمی کا دل ہے جس میں یہ یہ صفات ہوں۔ تلاش شروع ہو گئی۔ اور بالآخر وہ خوبیاں ایک دیہاتی نوجوان میں ملیں۔ جو والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بادشاہ نے اس کے ماں باپ کو بلایا۔ اور بے شمار دولت دے کر راضی کر لیا۔ اور قاضی نے خون بہانے کا فتوی دے دیا۔ جب جلاد تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا تو نوجوان نے بلند آواز سے کہا۔ ''اولاد کا پہلا سہارا والدین ہوتے ہیں۔ انھوں نے طمع زر سے مجھے بیچ ڈالا۔ دعوی قاضی کے پاس کیا جاتا ہے۔ وہ پہلے ہی فتوی دے چکا ہے آخری سہارا بادشاہ ہوتا

ہے۔اوراس کی زندگی میری موت میں ہے۔اب اے رب! صرف تیرا ہی سہارا باقی رہ گیا ہے"
یہ کہہ کر ہاتھ اٹھا لیے اور آسمان کی طرف تکنے لگا بادشاہ کو رحم آ گیا۔تخت سے اٹھا۔اس کے سر وچشم کو
چوما۔اور نہایت شان سے اسے واپس بھیج دیا۔کہتے ہیں کہ اسی ہفتے بادشاہ کو صحت ہوگئی۔

ہمچناں در فکر آں بیتم کہ گفت — پیلبا نے برلب دریائے نیل
زیر پایت گر بدانی حال مور — ہمچو حال تست زیر پائے پیل

(ایک فیلبان نے نیل کے کنارے کیا عمدہ بات کہی۔کہ تمہارے پاؤں
کے نیچے چیونٹی کا وہی حال ہوتا ہے۔جو تمہارا ہاتھی کے پاؤں تلے)

۱۰۔شیر اور لومڑی

لومڑی سے کسی نے پوچھا۔کہ تم نے شیر کی ملازمت کیوں اختیار کی۔کہا اس لیے تاکہ بچا
کھچا شکار ملتا رہے۔اوراس کی پناہ میں ہر گزند سے محفوظ رہوں۔پوچھا تم شیر سے دور دور کیوں
رہتی ہو۔کہا میں اس کی گرفت سے بھی ڈرتی ہوں۔داناؤں نے کہا ہے کہ بادشاہوں کی تلوّن
مزاجی (بار بار رنگ بدلنا) سے ڈرنا چاہیے۔

گاہے بہ سلاء بر نجند — و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند

(کہ کبھی تو سلام پہ بگڑ جاتے ہیں۔اور کبھی دشنام (گالی) پہ خلعت دے
دیتے ہیں)

۱۱۔نکتہ

دوستوں کی دوستی یا دشمنوں کی عداوت۔سب کچھ خدا کی طرف سے ہوتا ہے محبت وعداوت
کا منبع دل ہے اور سب کا دل اللہ کے بس میں ہے۔اگر تیر کمان سے گزر کر تم کو آ لگے۔تو کمان کو
کچھ نہ کہو۔کیونکہ پیچھے ایک کمان والا بھی ہے۔

۱۲۔ملازم وصاحب دل

ایک بادشاہ نے میر خزانہ سے کہا۔کہ ہمارا فلاں ملازم بڑا با ادب،فرماں بردار اور خدمت
گزار ہے۔اس کا مشاہرہ دوگنا کر دو۔ایک صاحب دل نے یہ بات سنی تو مست ہو گیا۔اور جھوم

جھوم کر کہنے لگا۔ اللہ کے حضور میں اس کے بندوں کا حال بھی یہی ہے۔

مہتری در قبول فرمان است ترک فرماں دلیل حرمان است

(سرداری، تعمیلِ فرمان میں ہے اور ترک فرماں موجب حرماں (محرومی) ہے)

۱۳۔ ہیزم درویش

ایک ظالم غریبوں سے ان کا جمع کردہ ایندھن ارزاں خرید لیتا تھا۔ کسی دانا نے اسے روکا۔ لیکن اس نے پرواہ نہ کی۔ ایک دن اس کے ٹال میں آگ لگ گئی۔ سب کچھ جل گیا۔ اور اب اس کے پاس بستر نرم کی جگہ۔ خاکستر گرم رہ گئی۔ اتفاقاً وہی دانا وہاں سے گزرا۔ اس وقت وہ ظالم اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا۔ کہ نہ جانے یہ آگ کہاں سے آئی۔ دانا نے جواب دیا۔

از دُودِ دل درویشاں

کہ غریبوں کے دل سے نکلی تھی۔

بہم بر مکن نا توانی دلے
کہ آہے جہانے بہم بر کند

(کسی دل کو پریشان نہ کرو۔ کہ غریب کی آہ دنیا کو تباہ کر دیتی ہے)

۱۴۔ وزیر و فقیر

ایک وزیر ذوالنون مصری[1] کے پاس گیا۔ اور کہا کہ میں رات دن بادشاہ کی خدمت کرتا ہوں۔ گو مجھے انعام و اکرام کی توقع تو ہوتی ہے۔ لیکن شاہی قہر سے بھی ڈرتا رہتا ہوں۔ اس لیے میرے لیے دعا فرمایئے۔ یہ بات سن کر اس کے آنسو نکل آئے اور فرمایا:۔

گر وزیر از خدا بتر سیدے ہمچناں کنز ملک ملک بودے

(کہ اگر وزیر خدا سے اتنا ہی ڈرتا۔ جتنا مِلک (سلطان) سے۔ تو آج مَلک (فرشتہ) ہوتا)

---

[1] ذوالنون مصری مصر کے ایک خدا رسیدہ ولی تھے۔ وفات ۲۴۵ھ = ۸۶۰ء

۱۵۔شاہ و بے گناہ

ایک بادشاہ نے ایک بے گناہ کی گردن اڑانے کا حکم دے دیا۔ بے گناہ نے کہا کہ اے بادشاہ! ایک ذاتی رنجش کی بنا پر اپنی تباہی مت خریدو۔ یہ قہر میرے سر سے ایک لمحے میں گزر جائے گا۔اور تیرے سر پر سدا باقی رہے گا۔

پنداشت ستمگر کہ ستم برما کرد
بر گردن او بماند برما بگزشت

(ظالم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ہمیں عذاب دیا ہے۔ یہ عذاب ہم سے گزر کر اس کی گردن کا ہار بن جائے گا)

۱۶۔دو بھائی

یہ دو بھائیوں کی کہانی ہے۔ان میں سے ایک بادشاہ کا ملازم تھا۔اور دوسرا محنت سے روزی کماتا تھا۔ایک دن وہ ملازم کہنے لگا۔ کہ تم بادشاہ کی خدمت کیوں نہیں کرتے۔تاکہ اس محنت سے بچ جاؤ۔ دوسرے نے کہا۔ کہ تم کام کیوں نہیں کرتے تاکہ خدمت کی ذلت سے نجات پاؤ۔ داناؤں کا قول ہے:۔

کہ نانِ جو خوردن و نشستن بہ کہ کمر زریں بستن و بخدمت ایستادن۔

(کہ سنہری پیٹی باندھ کر دوسروں کی غلامی کرنے سے بہتر یہ ہے کہ جَو کی روٹی کھا کر عزت سے گھر بیٹھو)

۱۷۔بشارت

ایک شخص خوش خوش نوشیرواں کے پاس گیا۔اور کہا کہ مبارک ہو۔کہ:۔

فلاں دشمنِ ترا خدا برداشت، گفت، ہیچ شنیدی کہ مرا بگذاشت۔

(کہ آپ کے فلاں دشمن کو خدا نے اٹھا لیا ہے۔ پوچھا کیا یہ بھی سنا ہے کہ مجھے اس نے چھوڑ دیا ہے؟)

۱۸۔ عقل ورزق

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے خُصَیب نامی ایک حبشی کو مصر کا گورنر لگا دیا۔ یہ اتنا بڑا دانشمند تھا۔ کہ جب ایک سال لوگوں نے اس کے پاس شکایت کی۔ کہ ہم نے نیل کے کنارے کپاس بوئی تھی۔ جو بے موسم بارشوں سے تباہ ہوگئی ہے تو کہنے لگا۔ تمہیں اون بونی چاہیے تھی کہ ضائع نہ ہوتی۔ ایک صاحب دل نے یہ بات سنی تو کہا:۔

اگر[1] روزی بدانش بر فزودے زنا داں تنگ تر روزی نبودے
بہ ناداں آنچناں روزی رساند کہ دانا اندر آں حیراں بماند

(اگر روزی عقل سے بڑھتی۔ تو سب نادان بھوکے ہوتے۔ خدا نادان کو یوں روزی دیتا ہے کہ دانا حیرت میں کھو جاتا ہے)

---

[1] اس پر علامہ اقبال کی تضمین ملاحظہ ہو:۔

فرنگ آئینِ رزّاقی بداند بہ آں بخشد ازیں وا می شاند
بہ شیطاں آنچناں روزے رساند کہ یزداں اندراں حیراں بماند

[1] انگریز رزق دینے کے طریقے خوب جانتا ہے۔ ایک سے چھینتا ہے اور دوسرے کو بخشتا ہے۔ وہ شیطان کو یوں روزی دیتا ہے کہ خدا بھی حیرت رہ جاتا ہے۔)

دوسرا باب

عدل[1]

۱۹۔ پلنگ سوار

بزرگوں سے سنا ہے کہ ایک صاحب دل چیتے پہ سوار تھا۔ اور ہاتھ میں چابک کی جگہ مار (سانپ) تھا۔ کسی نے پوچھا۔ کہ اے بزرگ! یہ خوفناک اور زہریلے جانور تمہارے خادم کیسے بن گئے۔ کہا اگر انسان خدا کے سامنے جھک جائے تو ساری کائنات اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔

چو خسرو بہ فرمان داور بود، خدایش نگہبان و یاور بود
محال است چوں دوست دارد ترا کہ در دست دشمن ترا

(اگر بادشاہ خدا کا فرماں بردار ہو تو خدا اس کا حافظ و مددگار ہوتا ہے اگر خدا تمہارا دوست ہو تو وہ تمہیں دشمن کے ہاتھ میں نہیں پڑنے دیگا)

۲۰۔ انوشیرواں کی نصیحت

انوشیرواں نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے ہرمز کو کہا کہ اے بیٹا! بقائے سلطنت کا راز یہ ہے کہ درویشوں کی خدمت کر۔ غریبوں پہ رحم کھا۔ رعیت کو آسودہ رکھ۔ مغرور گردن کشوں کو خاطر میں نہ لا۔ خدا ترس سے ڈر اور نا و نوش میں ڈوب کر رعیت سے غافل نہ ہو۔ کہ

نیاید بہ نزدیک دانا پسند
شباں خفتہ و گرگ در گو سفند

(داناؤں کو یہ بات پسند نہیں۔ کہ بھیڑیا تو ریوڑ میں گھسا ہوا ہو۔ اور گڈریا سو رہا ہو۔)

۲۱۔ شاہِ سادہ قبا

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نہایت سادہ سی قبا پہنتا تھا۔ کسی نے کہا۔ کہ اے شہنشاہ! یہ قبا آپ

---

[1] اس عنوان کے تحت سعدی نے کچھ ایسی حکایات بھی درج کر دی ہیں جن کا بظاہر عدل سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً اس لیے کہ اگر ان حکایات کی صفات بادشاہ میں پیدا ہو جائیں تو وہ بے انصافی نہیں کر سکتا۔

کی شان کے مطابق نہیں۔ زربفت یا کم خواب کی بنوایئے۔ فرمایا۔ لباس کا مقصد جسم کو ڈھانپنا ہے نہ کہ زیب و آرائش، میں رعیت سے مالیہ اس لیے نہیں لیتا کہ اسے تاج ولباس پر صرف کروں۔ اگر میں عورتوں کی طرح ریشمی لباس پہن لوں۔ تو دشمن کے مقابلے میں مرد کیسے بنوں گا؟ اور ملک میں نظم ونسق کیسے قائم رہے گا؟ اگر دہقان کا گدھا چور لے جائے۔ تو بادشاہ کو عشر و خراج لینے کا کوئی حق نہیں۔

چہ اقبال بینی دراں تخت و تاج
کہ دشمن خرش بردو سلطان خراج

(اس سلطنت میں تم کیا خوشی دیکھو گے۔ جہاں دہقان کا گدھا تو چور لے جائے اور مالیہ بادشاہ۔)

۲۲۔ دارا و چوپاں

کہتے ہیں کہ ایک دن شکار گاہ میں دارا اپنے سپاہیوں سے جدا ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک گڈریا اس کی طرف بھاگا آ رہا ہے۔ سمجھا کہ کوئی دشمن ہے۔ فوراً کمان میں تیر چڑھا لیا۔ گڈریے نے شور مچایا کہ اے خداوند! ذرا ٹھہریے۔ میں دشمن نہیں۔ بلکہ آپ کا چرواہا ہوں۔ اور یہاں آپ کے گھوڑے چرا رہا ہوں۔ اس پر بادشاہ کی گھبراہٹ دور ہوئی اور مسکرا کر کہنے لگا۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ آج بچ گئے ہو۔ چرواہا کہنے لگا۔ میرے آقا۔ جان کی امان پاؤں تو کہوں۔ کہ میں گھوڑوں کا چرواہا ہوں۔ اور آپ انسانوں کے۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت کونسا گھوڑا کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ لیکن آپ کا یہ حال۔ کہ دوست اور دشمن تک میں تمیز نہیں۔ آپ نے مجھے بارہا دربار دمحل میں دیکھا اور ریوڑ کا حال پوچھا۔ اب کہ میں سلام و نیاز کے لیے آپ کی طرف بڑھا ہوں۔ تو آپ نے مجھے دشمن سمجھ لیا۔

دراں دار ملک از خلل غم بود
کہ تدبیر شہ از شباں کم بود

(اس سلطنت کی خیر نہیں۔ جہاں بادشاہ کی عقل و تدبیر گڈریے سے بھی کم ہو)

۲۳۔ کتا اور مسافر

خبردار! غافل نہ سونا۔ کہ سالارِ قوم پہ خواب غفلت حرام ہے۔ تم یوں سویا کرو کہ مظلوم کی صدا نیند میں بھی تمہارے کانوں تک پہنچتی رہے۔ اگر تمہاری سلطنت میں کوئی ظالم کسی کو ستاتا ہے۔ تو وہ تمہارا ظلم سمجھا جائے گا۔

نہ سگ دامن کاروانی درید
کہ دہقان ناداں کہ سگ پر ورید

(مسافر کا دامن کتے نے نہیں پھاڑا۔ بلکہ اس کا ذمہ دار وہ احمق دہقان ہے۔ جس نے کتا پال رکھا ہے۔)

۲۴۔ تکلہ[1] و تخت

پہلی کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے۔ کہ جب تکلہ زنگی خاندان کے تخت پہ بیٹھا۔ تو ایک صاحب دل سے کہنے لگا۔ کہ میری عمر برباد جا رہی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تاج و تخت کو چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کی عبادت کروں دانا نے جواب دیا۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت صرف خدمت خلق کا نام ہے — نہ کہ تسبیح، سجادہ اور دلق کا
تو بر تخت سلطانی خویش باش — بہ اخلاق پاکیزہ درویش باش
تم تخت سلطنت ہی پہ رہو — اور پاکیزہ اخلاق سے درویش بنو
بزرگاں کہ نقد صفا داشتند — چنیں خرقہ زیر قبا داشتند

ہمارے[2] وہ بزرگ جو پاکیزہ اخلاق کے مالک تھے۔ قبا کے نیچے گویا گلیم بھی رکھتے تھے۔

---

[1] تکلہ بن زنگی اتابکانِ شیراز میں سے تیسرا تھا۔ اس نے ۱۱۸۵ء سے ۱۱۹۵ء تک حکومت کی (طبقات سلاطین اسلام از عباس

[2] آن مسلماناں کہ امیری کردہ اند — در شہنشاہی فقیری کردہ اند
در امارت فقر را افزودہ اند — مثلِ سلمان در مدائین بودہ اند (اقبال)

۲۵۔خدادوست

شام میں ایک عارف ایک غار میں عبادت کیا کرتا تھا۔اس کا نام خدا دوست تھا۔اسی زمانے میں شام کا حاکم بڑا ہی مردم آزار وسنگ دل تھا۔وہ عموماً اس عارف کی خدمت میں جاتا۔ لیکن عارف اس کی طرف نظر تک نہ اٹھاتا۔ایک دن اس نے شکایتاً کہا۔کہ حضور! میں آپ کی خدمت میں بڑی محبت وعقیدت سے حاضر ہوتا ہوں۔اور آپ مجھ سے بات تک نہیں کرتے۔یہ بے اعتنائی کیوں؟ فرمایا میرے پاس تمہاری محبت کا تو کوئی ثبوت ہے نہیں۔البتہ عداوت کے دو وزنی دلائل موجود ہیں:۔

اول: کہ تم میرے دوستوں (خلقِ خدا) کے دشمن ہو۔اور دوست کا دشمن، دشمن ہی ہوتا ہے۔

دوم: میرا ایک دوست (یعنی خدا تمہارا دشمن ہے۔اس لیے میں تمہیں اپنا دشمن سمجھنے پر مجبور ہوں۔

الاگر ہنر داری و عقل و ہوش
بفضل و ترحم میاں بند و کوش

(خبردار! اگر تم میں کچھ بھی عقل وہوش ہے۔تو خلقِ خدا کے ساتھ رحم وکرم سے پیش آؤ۔)

۲۶۔نکتہ

جب اللہ کسی قوم پہ خوش ہوتا ہے۔تو اس کی حکومت کسی عادل اور نرم دل انسان کے حوالے کرتا ہے۔اور جب وہ کسی ملک کو اجاڑنا چاہتا ہے۔تو اس پر کسی ظالم کو مسلط کر دیتا ہے۔شاہ عادل، اللہ کی نعمت ہے اور ظالم ایک لعنت بدکار لوگ اللہ کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔

چو خواہد کہ ویراں شود عالمے،
کند ملک در پنجۂ ظالمے،

۲۷۔عابد اور کھوپڑی

ایک عابد دریائے دجلہ کے کنارے مصروف عبادت تھا۔کہ ایک کھوپڑی پانی میں بہتی ہوئی ساحل کے قریب آگئی۔اور کہنے لگی۔کسی وقت میں بڑی شان کا مالک تھا۔تاج خسروی میرے سر پر تھا۔اور دنیا میرے کروفر سے کانپتی تھے۔میں نے عراق پر حملہ کیا۔اوراس پر قابض ہوگیا۔

طمع کردہ بودم کہ کرمان[1] خورم

کہ ناگہ بخوردند کرماں[2] سرم

پھر کرمان کو کھانے (یعنی فتح کرنے) کا منصوبہ بنایا۔لیکن اچانک موت آ گئی۔اور قبر کے کیڑے مجھے کھا گئے۔

۲۸۔توبہ

ایک بادشاہ بیمار ہوگیا۔جہاں بھر کے طبیبوں نے علاج کیا۔لیکن فائدہ نہ ہوا بالآخر ایک درباری نے کہا۔کہ اے جہاں پناہ!اس شہر میں ایک پرہیزگار رہتا ہے۔جس کی دعا سے تمام دکھ دور ہوجاتے ہیں۔اس سے دعا کرایئے۔بادشاہ نے قاصد بھیجا۔اور وہ درویش حاضر ہوگیا۔جب بادشاہ نے دعا کے لیے کہا تو بولا۔میری دعا سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔کہ آپ نے بیسیوں بے گناہوں کو چاہ وبند میں ڈال رکھا ہے۔مجھ ایک کی دعا کیسے کارگر ہوسکتی ہے۔جب ہر روز لاتعداد مظلوموں کے ہاتھ بددعا کے لیے اٹھتے ہیں۔یہ بات سن کر بادشاہ نے تمام قیدی چھوڑ دیئے۔اور مردم آزاری سے ہمیشہ کے لیے توبہ کرلی۔اس پر اس درویش نے دو رکعت نماز پڑھی۔ اور پھر ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا۔اے رب کائنات!یہ بادشاہ تجھ سے باغی ہوگیا تھا۔اور تو نے اس کے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا۔اب یہ اپنی حماقت پہ نادم اور تیرے فضل کا طالب ہے۔اس لیے رحم فرما۔ابھی اس کی دعا جاری تھی کہ بادشاہ تندرست ہوگیا۔اور محل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔پارسا نے شاہ کو مبارکباد دی اور کہا کہ آئندہ سنبھل کر چلو کہ

---

[1] کرمان: ایران کا ایک شہر

[2] کرماں: کرم کی جمع

ع۔ نہ ہر بار افتادہ برخاست است

(گرنے والا ہر بار نہیں اٹھتا۔)

۲۹۔ انوشیرواں و درویش

ایک درویش نے نوشیرواں سے کہا۔ کہ اے ملک جم کے وارث! اگر سلطنت کو دوام حاصل ہوتا تو جمشید کے بعد تمہاری نوبت نہ آتی۔ تمہاری دولت میں سے وہی باقی رہے گی۔۔۔۔ جو تم آج اللہ کے نام پہ دے جاؤ گے۔

۳۰۔ حکیم و کیقباد[1]

ایک دانشور نے کیقباد کو دعا دی۔ کہ اللہ تیری سلطنت کو ہمیشہ قائم رکھے اس پر ایک درباری نے اعتراض کیا۔ کہ جب بندہ فانی ہے تو اس کی سلطنت غیر فانی کیونکر ہو سکتی ہے۔ کہا اگر شاہ پارسا و عادل ہو تو اس کی سلطنت کو زوال نہیں آ سکتا۔

بہ مرگش چہ نقصان اگر پار ساست
کہ آقائی ہر دو عالم و راست

(اسے موت سے کیا نقصان۔ کہ دنیا و آخرت ہر دو میں وہ بادشاہ ہو گا۔)

۳۱۔ ظالم بادشاہ

ایک ظالم بادشاہ غریبوں سے ان کے گدھے چھین لیتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شکار کو گیا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک دہقانی اپنے گدھے پر بے تحاشہ لٹھ برسا کر اس کی ہڈیاں توڑ رہا ہے۔ بادشاہ کو غصہ آیا۔ اور دہقانی سے پوچھا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کہا کہ ہمارا بادشاہ غریبوں سے ان کے تمام اچھے گدھے چھین لیتا ہے۔ میں اپنے گدھے کی ٹانگ توڑ رہا ہوں۔ تا کہ میرا مال میرے پاس ہی رہے۔ بادشاہ ناراض ہو گیا۔ اسے پکڑ لیا۔ اور جلاد کو سر قلم کرنے کا حکم دے دیا۔ جب دہقانی نے دیکھا کہ کوئی آہ و فریاد کارگر نہیں ہوتی۔ تو کہنے لگا۔ کہ اے بادشاہ! تیرے ظلم سے صرف میں ہی

[1] کیانی خاندان ۲۹۶ ق م ۲۲۶ ء کا پہلا فرماں روا۔

نالاں نہیں۔ بلکہ سارا جہاں رو رہا ہے۔ اگر رونے کی سزا موت ہے تو پھر ساری رعیت کو ذبح کر ڈالو۔ اس صورت حال کا علاج ترکِ ظلم ہے۔ نہ کہ قتل بے گناہ۔ تمہارے مظالم سے ایک دنیا رات کو نہیں سوتی۔ نہ جانے تمہاری آنکھ کیسے لگ جاتی ہے۔ دنیا کو دکھ دینا اور پھر ان سے مدح وثنا کی امید رکھنا نادانی ہے۔

بادشاہ نے یہ تلخ وتیز باتیں سنیں۔ تو سوچ میں ڈوب گیا اور بعدازاں توبہ کر لی۔

ستائش سرایاں نہ یارِ تواند
ملامت کناں دوست دارِ تواند

(تمہارے حقیقی خیر خواہ یہ خوشامدی لوگ نہیں۔ بلکہ ملامت گیر ہیں۔
دوست وہ جو تمہیں تمہارے عیب بتاتے ہیں۔)

۳۲۔ بادشاہ و درویش

ایک بادشاہ کو ایک درویش کی بات اس قدر ناپسند آئی کہ اسے عمر بھر کے لیے جیل میں ڈال دیا۔ اس پر فقیر نے بادشاہ کو پیغام بھیجا۔ کہ اے سلطان! اگر آج تم اہل وعیال میں بیٹھے ہو۔ اور میں ان سے دور ہوں۔ اگر آج تم تخت وتاج کے مالک ہو اور میں اسیر ومفلس ہوں۔ تو غم نہیں کہ

بہ دروازۂ مرگ چوں در شویم
بیک ہفتہ باہم برابر شویم

کل موت کے بعد دونوں کو کیڑے کھا جائیں گے۔ اور صرف ایک ہفتے میں تو اور میں برابر ہو جائیں گے۔

تیسرا باب

احسان

۳۳۔ خار و گل

کسی آدمی نے اپنے ایک دوست کو خواب میں دیکھا۔ کہ چمن در چمن پھولوں میں ٹہل رہا ہے۔ پوچھا کہ تجھے یہ مقام کیسے ملا۔ جواب دیا۔ کہ ایک بار میں نے ایک یتیم کے پاؤں سے کانٹا نکالا تھا۔ اور

ع۔ وزاں خار برمن چہ گلہا دمید

(اور یہ تمام پھول اسی کانٹے سے نکلے ہیں۔)

۳۴۔ گبر و خلیلؑ

حضرت ابراہیم علیہ السلام مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ سات دن تک ان کے ہاں کوئی مہمان نہ آیا۔ اور وہ بھوکے رہے۔ آٹھویں دن انھیں ایک مسافر ملا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ اور اسے گھر لے آئے۔ جب کھانا کھانے لگے۔ تو مہمان نے بسم اللہ نہ پڑھی۔ اور حضرت خلیلؑ کے کہنے پر بھی وہ آمادہ نہ ہوا۔ ناچار حضرت ابراہیم نے خوان لپیٹ دیا۔ اور مہمان بھوکا اٹھ گیا۔ فوراً وحی آئی۔ کہ

من اُش دادہ صد سا روزی و جاں

ترا نفرت آمد ازاوٗ یک زماں

(اے ابراہیمؑ! میں نے اسے پیدا کیا۔ اور سو سال سے روزی دے رہا ہوں۔ اور تم اسے ایک وقت کا کھانا بھی نہ دے سکے۔)

۳۵۔ عابد و شاعر

ایک شاعر ایک عابد کے پاس گیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ میں ایک شخص سے دس درم لے بیٹھا

ہوں۔اوراس نے پیہم تقاضوں سے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے۔کبھی خود آتا ہے کبھی قاصد بھیجتا ہے۔ اور کبھی روک لیتا ہے۔خدا کے لیے اس لعنت سے میری جان چھڑایئے۔عابد نے اسے چند دینارو درا ہم دے کر رخصت کر دیا۔بعد میں ایک خادم کہنے لگا۔حضور یہ شخص تو ایک تو زبان دراز ٹھگ ہے۔اس پر آپ نے یہ خیرات کیوں ضائع کی؟ فرمایا کہ اگر وہ سچا تھا تو میں نے اس کی آبرو بچائی۔اوراگر جھوٹا تھا تو اپنی آبرو بچائی۔

۳۶۔غلیظ نانبائی

ایک پارسا سے اس کی بیوی نے کہا کہ ہمارا یہ ہمسایہ نانبائی بہت غلیظ ہے آپ کھانا کسی اور سے خریدا کریں۔جواب دیا کہ اے نیک خاتون۔

نہ مردی بود نفع زو وا گرفت　　بہ امید ما کلبہ اینجا گرفت
خریدار دکان بے رونق اند　　ببخشائے کا نانکہ مردِ حق اند

(اس غریب نے ہمارے ہی بھروسہ پر یہاں دوکان لی ہے۔اب اسے
چھوڑ کر کہیں اور جانا جوانمردی نہیں۔اس غریب پہ رحم کرو۔اور یاد رکھو کہ
اللہ کے بندے بے رونق دوکان ہی سے سودا خریدتے ہیں۔)

۳۷۔حجاز کا مسافر

کہتے ہیں کہ حجاز کا ایک راہی ہر قدم پہ دو رکعت نماز پڑھتا تھا۔اور اگر کوئی کانٹا چبھ جاتا تھا تو پاؤں ہی میں رہنے دیتا تھا۔ایک دن ہاتف نے اسے آواز دی۔

کہ نزلے بدیں حضرت آوردہٗ　　مپندار گر طاعتے کردہٗ
بہ از الف رکعت ہر منزلے　　باحسان آسودہ کردن دلے

(کہ اے مسافر! اگر تو نے عبادت کی ہے۔تو ہم پہ کوئی احسان نہیں کیا۔
یاد رکھو کہ احسان سے ایک دل کو راحت پہنچانا ہر منزل پہ ہزار رکعت ادا
کرنے سے بہتر ہے۔)

۳۸۔افطار وعید

کوتوال سے اس کی بیوی نے کہا۔ کہ جاؤ اور شاہی مطبخ سے ناشتہ لے آؤ کہ بچے بھوک سے رو رہے ہیں۔ کہا کہ آج مطبخ سرد ہے۔ کیونکہ شاہ نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ اس پر بیوی نے آہِ سرد لی اور کہا:۔

ندانم از ایں روزہ سلطان چہ خواست
کہ افطار او عید طفلان ماست

(نہ جانے بادشاہ کو اس روزے سے کیا حاصل ہے۔ جب کہ وہ جانتا ہے
کہ ہمارے بچوں کی عید اس کے افطار میں ہے۔)

۳۹۔سگِ تشنہ

بیابان میں ایک کتا پیاس سے مر رہا تھا۔ وہاں ایک رحم دل کا گزر ہوا اس نے اپنی ٹوپی کو ڈول اور دستار کو رسی بنا کر کنویں سے پانی نکالا۔ اور کتے کو پلایا۔ اس عہد کے پیغمبر نے اطلاع دی کہ اللہ نے اس کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں۔

کسے با سگے نیکوئی گم نکرد،
کجا گم کند خیر با نیک مرد

(جس اللہ نے کتے سے کی ہوئی نیکی کو ضایع نہیں کیا۔ وہ انسان پہ کیے
ہوئے احسان کو کیسے بھول سکتا ہے۔)

۴۰۔درویش وتونگر

ایک فقیر نے ایک تونگر کے دروازے پہ صدا لگائی۔ تونگر باہر آیا۔ اس غریب پہ کڑکا، برسا۔ اور ملازم سے دھکے لگوا کر نکال دیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا ملازم ایک اور شخص کے ہاں چلا گیا جو بڑا ہی نیک دل، کشادہ دست اور فیاض تھا۔ ایک رات اس کے در پہ ایک بھکاری آیا۔ اس نے ملازم کو حکم دیا کہ سائل کو راضی کرو۔ جب ملازم اس کے قریب پہنچا تو اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ آقا نے سبب پوچھا تو کہنے لگا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے یہ سائل فلاں شہر کا رئیس تھا

اور میں اس کے پاس ملازم تھا۔ آج اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ کہ بیٹا! اللہ بڑا عادل ہے۔ وہ کسی پر قطعاً ظلم نہیں کرتا۔ تمہیں یاد ہوگا۔ کہ ایک دن اس نے ایک سائل کو دھکے مار کر دروازے سے دھکیل دیا تھا۔

بروز منش دورِ گیتی نشا

(میں وہی سائل ہوں۔ اور قدرت کا انتقام دیکھیے۔ کہ آج وہی شخص میرے در پہ سائل بن کر آیا ہے۔)

۴۱۔ مور و عارف

ایک عارف نے شہر سے گندم خریدی اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ گندم میں ایک چیونٹی حیران پھر رہی ہے۔ اور اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ رہی ہے۔ اس غم سے وہ رات بھر نہ سو سکا۔ صبح ہوتے ہی اسے پکڑا اور اسی دوکان میں جا کر چھوڑ آیا۔

سیہ اندروں باشد و سنگ دل
کہ خواہد کہ مورے شود تنگ دل

(وہ آدمی بڑا ظالم و سیاہ دل ہے جس کے ہاتھ سے کسی چیونٹی کو بھی دکھ پہنچے)

۴۲۔ جوان و گوسفند

میں نے ایک جوان کو دیکھا کہ ایک گوسفند کو لیے جا رہا ہے۔ میں نے کہا۔ کہ یہ سب رسّی کی برکت ہے۔ ورنہ یہ بھاگ جاتا۔ اس نے رسّی کھول دی۔ اور گوسفند بدستور اس کے پیچھے چلتا رہا۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کہ یہ کیا طلسم ہے۔ تو جواب ملا۔

نہ ایں ریسماں می بُرد با مَنَش
کہ اُحسان کمند است در گردنش

(کہ اسے کھینچنے والی رسی نہیں۔ بلکہ احسان ہے۔ جس کا پھندا اس کی گردن میں پڑا ہے۔)

بداں را نوازش کن اے نیک مرد
کہ سگ پاس دارو چناں تو خورد

بُرے لوگوں کو احسان سے قابو کرو۔ کہ کتا تمہاری روٹی کھا کر تمہارا ہی بن جاتا ہے۔)

۴۳۔ درویش و رُوباہ

ایک درویش نے جنگل میں ایک شل (لنجی، لولی) لومڑی دیکھی۔ اور سوچنے لگا۔ کہ یہ کہاں سے کھاتی ہے۔ اسی اثنا میں وہاں ایک شیر آ گیا۔ جس کے منہ میں گیدڑ تھا۔ شیر گیدڑ کو کھا کر چلا گیا۔ اور باقی ماندہ سے لومڑی نے پیٹ بھر لیا۔ یہ منظر دیکھ کر درویش گوشۂ مسجد میں جا بیٹھا۔ اور کسبِ رزق کا دھندا چھوڑ دیا۔ ایک دو روز کے بعد اسے محراب سے آواز آئی۔ کہ اے پست ہمت! لومڑی کیوں بنتے ہو۔ جاؤ اور شیر بنو۔

بہ چنگ آر و با دیگراں نوش کن
نہ بر فضلۂ دیگراں گوش کن

(شکار مار کر دوسروں کو کھلاؤ۔ اور دوسروں کے پس خوردہ پہ نظر مت رکھو۔)

۴۴۔ حاتم کا گھوڑا

شاہِ روم کو کسی نے بتایا۔ کہ حاتم کے پاس اک ایسا تیز رفتار، خوش رنگ اور اصلی گھوڑا ہے۔ جس کی نظیر کہیں موجود نہیں۔ اس نے فوراً ایک قاصد حاتم کی طرف بھیجا۔ کہ جاؤ اور اس سے گھوڑا مانگ لاؤ۔ قاصد وہاں شام کے وقت پہنچا۔ اور رات کو میزبانئ حاتم کے مزے لوٹے۔ دوسری صبح جب اپنا مقصد بیان کیا۔ تو حاتم نے کہا۔ کاش یہ بات تم نے کل کہی ہوتی۔ میں نے تو کل شام ہی کو وہ گھوڑا آپ کی ضیافت کے لیے ذبح کر دیا تھا۔ جب یہ خبر شاہِ روم کو پہنچی تو:

ع۔ ہزار آفریں گفت بر مردِ طے

اس نے قبیلۂ طے کے اس جواں مرد پر ہزار شاباش بھیجی۔

۴۵۔ حاتم اور شاہِ یمن

یمن کا ایک بادشاہ اس کوشش میں تھا کہ سخاوت میں وہ حاتم سے بڑھ جائے۔ جب سالہا سال کی کوششوں کے بعد بھی وہ ناکام رہا۔ تو اس نے ایک شخص کو بلایا۔ اور کہا کہ جاؤ۔ حاتم کا سر

کاٹ لاؤ۔ اور منہ مانگا انعام پاؤ۔ وہ شخص چل پڑا۔ اور جب قبیلہ طے کے قریب پہنچا۔ تو اسے ایک شخص اپنے گھر لے گیا۔ اور بے حد خاطر مدارت کی۔ جب وہ اگلی سحر کو چلنے لگا۔ تو میزبان نے کہا۔ کہ چند روز اور ٹھہریے اور مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔ کہنے لگا کہ میں ایک نہایت ضروری کام پہ نکلا ہوں، اور رک نہیں سکتا۔ میزبان نے کہا کہ اگر آپ مجھے اپنا کام بتا دیں تو شاید میں بھی کچھ مدد کر سکوں۔ کہنے لگا کہ یمن کے بادشاہ نے حاتم کا سر مانگا ہے۔ اور مجھ سے بے اندازہ دولت کا وعدہ کیا ہے۔ اگر آپ مجھے اس کا پتہ اور حلیہ بتا سکیں تو بڑی نوازش ہوگی۔ یہ سنتے ہی:

بخندید برنا کہ حاتم منم،
اینک جدا کن بہ تیغ از تنم،

(وہ جوان مسکرایا اور کہا کہ حاتم میں ہی ہوں اور یہ سر حاضر ہے۔ کاٹ کر فوراً نکل جایے۔ تا کہ صبح کے وقت میرے قبیلے کے لوگ حائل نہ ہو جائیں۔)

اس پہ وہ شخص حاتم کے پاؤں پہ گر گیا۔ اس کے ہاتھوں کو چوما۔ معافی مانگی۔ بغل گیر ہوا۔ اور واپس چل پڑا۔ جب یمن میں پہنچا۔ اور بادشاہ نے ناکامی کی وجہ پوچھی تو اس نے ساری کہانی سنائی۔ اور کہا کہ قتل کے ارادے سے تو میں گیا تھا۔ لیکن بات الٹی پڑ گئی:

مرا بار لطفش دوتا کرد پشت
بہ شمشیر احسان و فضلم بکشت

(اس کی نوازشات کے بوجھ سے میری کمر دوہری ہو گئی ہے۔ اور اس نے احسان کی تلوار سے مجھے ذبح کر دیا ہے۔)

۴۶۔ حاتم کی بیٹی

ایک جنگ میں چند قیدی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ان میں حاتم کی بیٹی بھی شامل تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا بہت احترام کیا۔ اس کی جاں بخشی کی۔ لیکن باقی تمام کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس پر یہ بول اٹھی۔ "اے رسول خدا! یا تو میرے قبیلے کے تمام اسیروں کو

آزاد فرمایئے۔ اور یا مجھے بھی ان کے ساتھ قتل کر دیجئے۔ کہ ان کے بعد میری زندگی میرے لیے تنگ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دختر حاتم کا دکھ نہ دیکھ سکے۔ اور سب کو آزاد کر دیا۔

۴۷۔ حاتم و سائل

ایک سائل نے حاتم سے دس درہم مانگے۔ اور اس نے شکر کی ایک بوری اسے دے دی۔ کسی نے پوچھا کہ اس میں کیا حکمت تھی۔ کہا کہ اس کا سوال اس کے ظرف کے مطابق تھا۔ اور میری عطا میری ہمت کے مطابق۔

۴۸۔ خرِ دَرِ گِل

ایک بادشاہ شکار کھیلتے کھیلتے ایک ایسی جگہ جا پہنچا۔ جہاں ایک گدھا کیچڑ میں دھنسا ہوا تھا۔ اور دہقان پاس بیٹھ کر شاہ وقت کو ہزار صلواتیں سنا رہا تھا۔ ایک ملازم نے قتل کا مشورہ دیا۔ لیکن عالی ظرف بادشاہ نے قبول نہ کیا۔ بادشاہ اس دہقان کے پاس گیا۔ اس کا گدھا دلدل سے نکلوایا۔ اور اسے انعام و اکرام سے مالا مال کر کے آگے نکل گیا۔

بدی را بدی سہل باشد جزا
اگر مردی اَحْسِنْ اِلیٰ مَنْ آسا

(بدی کا بدی سے بدلہ دینا آسان ہے۔ اگر جواں مرد ہو تو بد کن سے نیکی کرو)

۴۹۔ سائل و سنگ دل

ایک سائل ایک سنگ دل کے در پر پہنچا۔ اس نے در بند کر دیا۔ اور اندر بیٹھ گیا۔ سائل دیر تک صدائیں لگاتا رہا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ ہمسائیگی میں ایک اندھا رہتا تھا۔ وہ دیوار کو ٹٹولتے ٹٹولتے باہر آیا۔ سائل کو اپنے ہاں لے گیا۔ اور ماحضر سامنے رکھ دیا۔ صبح کے وقت سائل نے اس کی آنکھوں کو مس کیا۔ اور معاً اس کی نظر لوٹ آئی۔ یہ خبر آناً فاناً ہر طرف پھیل گئی۔ جب اس سنگ دل تک پہنچی۔ تو سنا ہے کہ دستِ حسرت مل مل کر اندھے سے کہتا تھا:

کہ شہباز من صید دام تو شد
مرا بود دولت بنام تو شد

(ہائے افسوس! یہ شہباز میرا تھا۔ لیکن تمہارے دام میں جا پھنسا۔ یہ دولت
میرے گھر آئی تھی۔ لیکن تمہیں مل گئی۔)

۵۰۔ جوان و پیر

ایک جوان نے کسی مشکل وقت میں ایک بوڑھے کی مدد کی تھی۔ ایک دن یہ بوڑھا بازار میں جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پولیس اس جوان کو مارتے پیٹتے مقتل کی طرف لیے جاتی ہے۔ یہ آگے بڑھا۔ اور با آواز بلند کہا۔ کہ اے لوگو! بادشاہ سلامت فوت ہو گئے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ پولیس اس جوان کو چھوڑ کر محل کی طرف بھاگی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی۔ پولیس واپس آئی۔ وہ نوجوان تو کہیں جا چکا تھا۔ البتہ وہ بوڑھا موجود تھا۔ اسے پکڑ کر حضورِ شاہ میں لے گئی بادشاہ نے اس حرکت کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگا۔ عالم پناہ! ایک دفعہ اس نوجوان نے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں نے اس کا بدلہ ادا کیا ہے۔

بقول دروغے کہ سلطان بمَرد
نمردی و بے چارۂ جاں بُرد

(آپ کی جھوٹی خبر وفات سے اس کی جان بچ گئی ہے۔ اور آپ بھی
بفضل خدا صحیح وسلامت موجود ہیں۔)
بادشاہ کو یہ بات پسند آئی اور اسے چھوڑ دیا۔

۵۱۔ ٹھنڈا سایہ

ایک آدمی نے خواب میں دیکھا۔ کہ محشر بپا ہے۔ تمام دنیا دھوپ میں جل رہی ہے۔ لیکن ایک آدمی گھنے درخت کے سائے میں کھڑا ہے۔ اس سے کسی نے وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگا کہ دنیا میں ایک دن ایک درویش دھوپ اور گرمی سے نڈھال جا رہا تھا۔ میں اسے اپنے ہاں لے گیا۔ اور انگور کی ٹھنڈی بیل کے نیچے سلا دیا۔ یہ اسی عمل کا پھل ہے۔

چوتھا باب

صدق ومحبت

۵۲۔خدا و ناخدا

ایک مرتبہ میں اور ایک درویش ایک دریا پہ پہنچے۔ ہمیں پار جانا تھا۔ میرے پاس ایک درم تھا۔ چنانچہ مجھے تو کشتی میں جگہ مل گئی۔ لیکن وہ درویش رہ گیا۔ مجھے ساتھی سے بچھڑنے کا بہت ملال ہوا۔ کچھ دیر کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے پانی پہ مصلےٰ بچھایا ہوا ہے اور جا رہا ہے۔ جب کشتی کنارے پہ لگی۔ تو فقیر نے آواز دی۔

ع۔ ترا کشتی آورد و مارا خدا

(کہ اے سعدی! تمہیں ساحل پہ کشتی نے پہنچایا ہے اور مجھے خدا نے۔)

کودک بدست شناور دراست　　نترسد وگر دجلہ پہنا دراست

(اگر ایک بچہ تیراک کے ہاتھ میں ہو تو وہ دجلہ کی پہنائیوں سے نہیں ڈرتا۔)

نگہ دارد از تاب آتش خلیلؑ　　چو تابوت موسیٰؑ زغرقاب نیل

(نیل کی لہروں میں موسیٰؑ کے صندوق کو اسی خدا نے بچایا تھا۔ جو حضرت خلیلؑ کو آگ کے شعلوں سے صحیح وسالم نکال لایا تھا۔)

تو بر روئے دریا قدم چوں زنی
چوں مرداں کہ بر خشک تر دامنی

(تمہیں دریا میں قدم رکھنے کی جرأت کیونکر ہو سکتی ہے۔ کہ تمہارا دامن خشکی ہی پر بھیگا[1] ہوا ہے۔)

---

[1] تردامن ہونا۔ گناہ میں ملوث ہونا۔

۵۳۔ پیر شام

ایک دفعہ شام کے ایک شہر میں ایک کہرام سا بپا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ سپاہی ایک عابد و زاہد کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ میں اس درویش کو زنداں میں ملنے گیا۔ تو دیکھا کہ وہ ہر قسم کے ملال سے آزاد اور شاد و مطمئن تھا۔ میں نے اس اطمینان کی وجہ پوچھی تو کہنے لگا:

اگر عزہ و جاہ است گر ذل و قید
من از حق شناسم نہ از عمر و زید

(عزت، ذلت، سکھ اور دکھ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ نہ کہ عمرو زید کی طرف سے۔)

بخور ہرچہ آید ز دستِ حبیب
نہ بیمار دانا تر است از طبیب

(محبوب کے ہاتھ سے جو ملے کھا لو۔ کہ طبیب بیمار سے زیادہ دانا ہوتا ہے۔)

۵۴۔ پسند

ایک آدمی نے ایک درویش سے پوچھا۔ کہ تمہیں جنت پسند ہے یا جہنم جواب دیا۔

بگفتا مپرس از من ایں ماجرا
پسندیدم آنچہ پسند و مرا

(کہ یہ سوال خدا سے پوچھو۔ مجھے وہ پسند ہے۔ جو اللہ کو پسند ہو۔)

۵۵۔ جگنو

کسی نے جگنو سے پوچھا۔ کہ تم دن کو کیوں باہر نہیں آتے۔ کہا میں تو دن رات باغ میں رہتا ہوں۔ لیکن آفتاب کے سامنے میرا دیا نہیں جلتا۔

پانچواں باب

تواضع

۵۶۔ خاشاکِ مسجد

کہتے ہیں کہ ایک پاکیزہ سیرت جوان روم میں ایک عالم کے پاس تحصیل علم کے لیے گیا۔ ایک دن استاد نے حکم دیا۔ کہ مسجد کو صاف کرو۔ اور تمام کوڑا کرکٹ باہر پھینکو۔ اس پر وہ جوان وہاں سے غائب ہو گیا۔ دوسرے روز خادم مسجد نے اسے راہ میں جالیا۔ اور اس حرکت کی وجہ پوچھی۔ تو کہنے لگا کہ مسجد کا کوڑا کرکٹ میں ہی تو تھا۔ سو باہر آ گیا ہوں۔

بلندیت باید تواضع گزیں،

کہ ایں بام را نیست سلّم جزیں

(اگر تم بلندی چاہتے ہو تو تواضع اختیار کرو۔ کہ اس بام کا زینہ یہی ہے۔)

۵۷۔ شہد فروش

ایک شہد فروش اس قدر خوش مزاج تھا۔ کہ اس پر خریدار مکھیوں کی طرح گرتے تھے۔ دیکھا دیکھی ایک بدمزاج نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ اس کی ترشی و تلخی کا یہ عالم تھا۔ کہ خریدار تو رہے ایک طرف، مکھیاں بھی اس کی شہد سے بھاگتی تھیں۔ ایک شام نہایت مایوسی کے عالم میں اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ کہ میرا شہد خالص بھی ہے اور ارزاں بھی۔ نہ جانے بکتا کیوں نہیں جواب ملا۔

مع۔ عسل تلخ باشد ترشروئے را

(کہ بدمزاج آدمی کا شہد ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔)

۵۸۔ بدمست

ایک بدمست شرابی نے ایک نیک آدمی کو گریبان سے پکڑا اور دو چار جڑ دیں۔ اس نے مزاحمت نہ کی۔ اور خاموشی سے مار کھالی۔ کسی نے کہا۔ آخر آپ بھی مرد تھے۔ اس لفنگے کا منہ کیوں نہ توڑا۔ جواب دیا۔

ہنرور چنیں زندگانی کند،
جفا بیند و مہربانی کند،
(کہ اہلِ خرد کا وطیرہ ہی یہی ہے کہ مار کھا کر مہربانی کرتے ہیں۔)

۵۹۔صحرانشیں اور کتا

ایک کتے نے ایک صحرانشیں کی لات کو اس بری طرح سے کاٹا۔ کہ وہ تکلیف کی وجہ سے رات بھر جاگتا رہا۔اس کی لڑکی کہنے لگی۔ بابا! آخر تمہارے منہ میں بھی دانت تھے۔تم نے اسے کیوں نہ کاٹا۔جواب دیا۔

تواں کرد با ناکساں بد رگی
و لیکن نیاید زمردُم سگی
(اے بیٹی! یہ تو ممکن ہے کہ کوئی آدمی کمینوں کے مقابلے میں تھوڑا سا کمینہ بن جائے۔لیکن اس کے لیے کتا بننا ناممکن ہے۔)

۶۰۔معروف کرخیؒ[1] اور مہمان

ایک مرتبہ معروف کرخیؒ کے ہاں ایک مہمان آیا جس کی عمر سو کے قریب تھی۔اور مختلف بیماریوں میں گرفتار تھا۔ وہ رات کو نہ خود سوتا نہ کسی کو سونے دیتا۔معروف جان و دل سے اس کی خدمت کرتا اور رات بھر جاگتا رہتا۔ایک رات معروف کی کہیں آنکھ لگ گئی۔ بوڑھے نے اسے فوراً کوسنا شروع کر دیا اور یہاں تک کہہ گیا کہ یہ ٹھگ دنیا کو لوٹ رہا ہے۔ یہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ وغیرہ وغیرہ۔اس پر گھر والوں نے کہا۔ کہ یہ بوڑھا نہایت احسان فراموش اور کمینہ ہے۔اسے چلتا کرو۔معروف نے جواب دیا۔

چہ خود را قوی حال بینی و خوش،
بہ شکرانہ بار ضعیفان بکش،
(کہ اگر تم تندرست اور خوش حال ہو تو بطور شکرانہ ضعیفوں اور بیماروں کا بوجھ اٹھاؤ۔)

---

[1] بغداد کے ایک محلہ کرخ کے رہنے والے ایک ولی جن کی وفات ۲۰۰ھ = ۸۱۶ء میں ہوئی۔

نہ بینی کہ در کرخ تربت بسے ایست
بجز گور معروفؒ معروف نیست

(دیکھتے نہیں کہ کرخ میں لاتعداد قبریں ہیں۔لیکن تنہا معروف کی قبر مشہور ہے۔اور باقی تمام لوگوں کو دنیا بھول چکی ہے۔)

٦١۔درویش و سائل

ایک سائل ایک درویش کے پاس گیا۔اور خیرات کے لیے ہاتھ پھیلایا۔اتفاقاً اس وقت درویش بالکل تہی دست تھا۔کہنے لگا۔آج معاف کرو بابا۔پھر کبھی آنا اس پر سائل مشتعل ہو گیا۔اور باہر آ کر کہنے لگا۔کہ درویش مکار، گندم نما جو فروش، پیٹو اور ٹھگ ہے۔جب یہ خبر شیخ کو ملی۔تو فرمایا۔میرے عیوب بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ اس شخص نے کہا ہے وہ بہت کم ہے۔

ولے امسال پیوست باما وصال
کجا داندم عیب ہفتاد سال

(وہ اس سال میرے پاس صرف چند لمحوں کے لیے آیا تھا۔وہ میرے ستر سال کے عیوب بھلا کیا جانے۔)

٦٢۔صالح[1] اور دو درویش

شام کا ایک بادشاہ الملک الصالح لباس بدل کر رات کو شہر میں گھوم رہا تھا۔سحر کے وقت ایک مسجد میں پہنچا۔کیا دیکھتا ہے کہ دو درویش ایک گوشے میں سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں۔اور بادشاہ کو کوس رہے ہیں۔کہ ہم تو سردی میں مر رہے ہیں۔اور ہمارا بادشاہ سنجاف وسمور کے بستر میں مست سویا ہوا ہے ایک کہنے لگا کہ اگر کل یہ بادشاہ بہشت میں جا پہنچا۔تو میں وہاں ہرگز نہیں رہوں گا دوسرا کہنے لگا بھلا ہم وہاں سے کیوں نکلیں۔میں اس کے سر پہ اتنے جوتے برساؤں گا کہ سر پہ پاؤں رکھ کر بہشت سے بھاگ جائے گا۔صبح کے وقت جب بادشاہ دربار میں آیا۔تو ان فقرا کو طلب کیا۔اور انھیں اتنا کچھ دیا کہ وہ زندگی بھر کے لیے فکر معاش سے آزاد ہو گئے جب وہ رخصت ہونے لگے۔تو بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا:

[1] ایوبیانِ دمشق میں سے ایک فرماں روا کا نام اسمٰعیل صالح تھا جس نے ٦٣٧ھ سے ٦٤٣ھ تک حکومت کی۔

من امروز کردم در صلح باز،
تو فردا مکن در بر دیم فراز
(میں نے آج آپ سے صلح کر لی ہے۔ امید ہے کہ کل آپ مجھ پہ در
جنت بند نہیں کریں گے۔)

۶۳۔ حکایت کوشیار[1]

کوشیار کے پاس ایک ایسا طالب العلم گیا۔ جو علم نجوم میں درک کم اور غرور زیادہ رکھتا تھا۔
مدتوں حلقۂ درس میں شامل رہا۔ لیکن فیض نہ پا سکا۔ جب وہاں سے چلنے لگا تو استاد نے فرمایا:
تو خود را گماں بُردہٴ پُر خرد،
انائے کہ پُرشد دگر چوں بَرد
تم اپنے آپ کو بڑا عقل مند سمجھتے تھے۔ اس لیے محروم رہے۔ کہ جو برتن
پہلے ہی پُر ہو۔ اس میں کچھ اور قطعاً نہیں سما سکتا۔

۶۴۔ بہرہ حاتم

حاتم کے متعلق مشہور تھا۔ کہ وہ بہرہ ہے۔ ایک روز ایک مکھی مکڑی کے جال میں پھنس کر تڑپنے اور رونے لگی۔ تو حاتم نے کہا کہ مکھی جسے قند سمجھتی تھی وہ قید نکلی۔ اس پر کسی نے کہا۔ کہ آپ بہرے ہیں۔ یہ مکھی کی آواز کیسے سن لی۔ کہنے لگا۔ میں بہرہ نہیں ہوں۔ لیکن بنتا ہوں۔ تاکہ لوگ میرے سامنے میرے عیب بیان کریں اور میں اپنی اصلاح کر سکوں۔

۶۵۔ لقمانؒ

ایک آدمی کا ایک غلام بھاگ گیا۔ اس کے ملازم تلاش میں نکلے۔ تو غلطی سے لقمان کو پکڑ لائے۔ آقا نے بن دیکھے حکم دیا کہ اسے گارا اٹھانے پہ لگا دو۔ جب سال بعد عمارت مکمل ہو گئی۔ تو آقا کو معلوم ہوا کہ لقمان کو غلطی سے پکڑ لیا گیا تھا۔ اس نے معذرت کی اور معافی مانگی۔ اس پر لقمان نے کہا۔ کہ گو سال بھر کے دکھ کو فراموش کرنا مشکل ہے۔ تاہم:

---

[1] ابوالحسن کوشیار ایران کا ایک نجم جو بو علی سینا کا استاد تھا۔

ولے ہم بہ بخشائم اے نیک مرد
کہ سود تو مارا زیا نے نکرد

(میں تمہیں معاف کرتا ہوں کہ تمہیں فائدہ پہنچا۔ اور میرا کوئی نقصان نہیں ہوا)

۶۶۔ جنید بغدادیؒ[1] اور کتا

جنید بغدادیؒ بیابان میں جا رہے تھے۔ کہ ایک کتا نظر آیا۔ جو بھوک سے مر رہا تھا۔ جنیدؒ نے زادِ راہ میں سے نصف اسے کھلا دیا اور وہ اٹھ بیٹھا:

شنیدم کہ می رفت و خوں می گریست
ندانم کہ بہتر زما ہر دو کیست

سنا ہے کہ جنید جا رہا تھا۔ اور رو رو کر کہہ رہا تھا نہ جانے ہم دونوں میں سے بہتر کون ہے۔

ازیں بر ملائک شرف یا فتند
کہ خود را بہ ازسگ نہ پنداشتند

یہ لوگ فرشتوں سے بھی اونچا مقام رکھتے تھے۔ کیونکہ اپنے آپ کو کتے سے بھی بہتر نہیں سمجھتے تھے۔

۶۷۔ مست و پارسا

ایک مست، رباب بغل میں لیے جا رہا تھا۔ کہ سامنے سے ایک پارسا آ گیا۔ مست نے اس کے سر پر اس زور سے ساز مارا کہ ساز ٹوٹ گیا اور سر زخمی ہو گیا۔ فوراً پارسا نے جیب سے کچھ درہم نکال کر مست کے پیش کیے۔ اور کہا کہ میرا زخم تو مفت ہی اچھا ہو جائے گا۔ لیکن اس ساز کی مرمت پہ کچھ خرچ ہوگا۔ سو یہ حقیری رقم حاضر ہے۔

از ایں دوستان خدا بر سراند
کہ از خلق بسیار بر سر خورند

---

[1] جنیدؒ: وفات ۲۹۷ھ = ۹۱۰ء

اللہ کے بندوں سے دنیا اسی لیے پیار کرتی ہے۔ کہ یہ دنیا کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھاتے ہیں۔

۶۸۔ فاروق اعظمؓ اور گدا

فاروق اعظمؓ اندھیرے میں جا رہے تھے۔ کہ ایک فقیر کے پاؤں پہ ان کا پاؤں پڑ گیا۔ فقیر نے کہا۔ ابے او اندھے! دیکھ کر چل۔ فاروق اعظمؓ نے کہا۔ میرے بھائی! مجھ سے غلطی نادانستہ ہوئی ہے۔ اس لیے معاف کر دو۔

فروتن بود ہوشمند گزیں
نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمین

(عقلمند ہمیشہ عاجزی سے کام لیتا ہے۔ کیونکہ میوہ دار ٹہنی زمین کی طرف جھک جاتی ہے۔)

۶۹۔ ذوالنونؒ اور خشک سالی

کہتے ہیں کہ ایک سال مصر میں مہینوں بوند نہ ٹپکی۔ اور دنیا مبتلائے مصیبت ہو گئی۔ جب یہ خبر ذوالنون کو ملی تو وہ فوراً مدین کی طرف بھاگ گیا۔ اور جھٹ بارش ہو گئی۔ کسی نے اس کی وجہ پوچھی۔ تو ذوالنون نے کہا۔ کہ بعض اوقات اچھوں کا رزق بروں کی وجہ سے بند ہو جاتا ہے۔ مجھے اس شہر میں اپنے سوا کوئی برا انسان نظر نہ آتا تھا۔ سو میں باہر آ گیا۔ تا کہ وہ لوگ میری وجہ سے مبتلائے مصیبت نہ رہیں۔

بہ دولت کسانے سرا فراختند
کہ تاج تکبر بیند اختند

(دنیا میں وہی لوگ سر بلند رہتے ہیں۔ جو تاجِ تکبر کو دور پھینک دیتے ہیں۔)

چھٹا باب

تقدیر

۷۰۔ چشمِ بد کا علاج

ایک آدمی نے دفع نظر کے لیے اپنے کھیت میں گدھے کا سر لٹکا رکھا تھا۔ ایک دانشور وہاں سے گزرا تو کہنے لگا۔ جس گدھے کے سر پہ زندگی بھر ڈنڈے برستے رہے۔ اور وہ انہیں نہ روک سکا۔ وہ مرنے کے بعد بھلا چشم بد سے کیا روکے گا۔

۷۱۔ مریض و طبیب

ایک مریض دردِ دل کی وجہ سے تڑپ رہا تھا۔ طبیب نے کہا کہ صبح تک اس کا زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ جب صبح ہوئی تو دنیا یہ دیکھ کر حیران ہوگئی کہ مریض کو تو شفا ہو چکی تھی۔ لیکن طبیب اگلے جہاں پہنچ چکا تھا۔

۷۲۔ چیل اور گِدھ

ایک گدھ نے چیل سے کہا۔ کہ میری نظر اتنی تیز ہے کہ زمین پر رینگتی ہوئی ایک چیونٹی تک مجھے نظر آ جاتی ہے۔ وہ دیکھو بیابان میں ایک دانہ پڑا ہے۔ جو مجھے یہاں سے نظر آ رہا ہے۔ یہ کہہ کر گدھ دانے کی طرف جھپٹی اور دام میں پھنس کر رہ گئی۔

شنیدم کہ می گفت و گردن بہ بند
نہ باشد حذر با قدر سُود مند

(سنا ہے کہ پھنسنے کے بعد وہ یہ کہتی تھی کہ تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر نہیں چل سکتی۔)

۷۳۔ بچہ ٔ ناقہ

اونٹ کے بچے نے ماں سے کہا۔ کہ آج تم نے بہت سفر کیا ہے۔ کچھ دیر کے لیے سو جاؤ۔ کہنے لگی کہ اگر میری مہار میرے ہاتھ میں ہوتی۔ تو تم مجھے اس قطار ہی میں نہ دیکھتے۔

قضا کشتی آں جا کہ خواہد برد
و گر ناخدا جامہ بر تن درد

(خدا کشتی کو جہاں چاہے لے جاتا ہے۔ خواہ ناخدا تن کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔)

ساتواں باب

قناعت

۷۴۔علاجِ تپ

ایک درویش کو تپ چڑھ گیا۔طبیب نے اس کا علاج گلقند تجویز کیا۔اب اتفاق یہ کہ تمام شہر میں گلقند صرف ایک بدمزاج تونگر کے پاس تھی۔کسی نے درویش سے کہا۔کہ اس سے منگوا لیجیے۔جواب دیا۔

بگفت اے پسر تلخی مُردنم،
بہ از جور روئے ترش بُردنم

(کہ اے بیٹے! میرے لیے مرنا آسان ہے۔لیکن اس بدمزاج کی ترش روئی کو برداشت کرنا مشکل ہے۔)

۷۵۔بارِ شکم

میں چند درویشوں کے ساتھ ایک باغ میں گیا۔ہم میں سے ایک بہت بڑا پیٹو تھا۔جو ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا تھا۔وہاں پہنچتے ہی وہ ایک درخت پہ چڑھ گیا۔اور لگا تنور شکم بھرنے۔کچھ وقت کے بعد وہ پیٹ کے بوجھ کو سنبھال نہ سکا۔دھڑام سے نیچے آن پڑا۔اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔

برو اندرونے بدست آر پاک
شکم پر نخواہد شُد اِلّا بخاک

(جاؤ۔من کو صاف کرو۔اور بندۂ شکم نہ بنو۔کہ شکم خاکِ گور ہی سے پُر ہوگا۔)

۷۶۔خوانِ یغما[1]

ایک آدمی ہمیشہ پیاز سے روٹی کھایا کرتا تھا۔کسی نے کہا کہ تم خوانِ یغما پہ کیوں نہیں

[1] پرانے زمانے میں ترکوں کے ہاں دستور تھا کہ عمدہ عمدہ کھانے گھر کے صحن میں چن کر دروازہ کھول دیتے تھے اور بھوکوں کی چھین جھپٹ اور مار کٹائی سے محظوظ ہوتے تھے۔یہ خوانِ یغما کہلاتا تھا۔

جاتے۔ وہاں سے کباب و پلاؤ کی چند قابیں اٹھالاؤ۔ اور مزے اڑاؤ۔ کباب و پلاؤ کا نام سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور چل دیا۔ وہاں لوٹ مار میں اس کے کپڑے پھٹ گئے اور ہاتھ ٹوٹ گیا۔ واپس آکر توبہ کی۔ اور کہا کہ:

بلا جوئے باشد گرفتار آز
من و خانہ من بعد نان و پیاز

(لالچی ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں پھنستا ہے۔ اے اللہ! میری توبہ۔ آج کے بعد یہ گھر ہوگا۔ میں ہوں گا اور وہی نان و پیاز۔)

۷۷۔ دندان و نان

ایک بچے کے دانت نکل رہے تھے اور اس کا مفلس باپ اس فکر میں گم تھا کہ اس کے لیے روزی کہاں سے آئے گی۔ اس نے بیوی سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ تو بیوی نے کیا اچھی بات کی۔

مخور ہولِ ابلیس تا جان دہد
ہماں کس کہ دندان دہد نان دہد

شیطان تمہیں ڈرا رہا ہے کہ بچہ بھوک سے مر جائے گا۔ خبردار! شیطان کی بات مت سنو۔ جس اللہ نے اسے دانت دیے ہیں، وہ روزی بھی دے گا۔

۷۸۔ سُود خور

ایک سود خور زینے سے گرا۔ اور ہلاک ہوگیا۔ رات کو بیٹے کے خواب میں آیا۔ بیٹے نے حال پوچھا۔ تو جواب دیا۔

بگفت اے پسر قصہ برمن مخواں
بدوزخ در افتادم از نردباں

(کہ اے بیٹے! حال کیا پوچھتے ہو۔ زینے سے سیدھا جہنم میں آگرا ہوں۔)

۷۹۔خانۂ صاحب دل

ایک صاحب دل نے معمولی سا گھر بنوایا۔کسی نے کہا۔کہ آپ تو آسودہ حال تھے۔اس سے بہتر عمارت بنا سکتے تھے۔کہا:

نہ از معرفت باشد و عقل و رائے
کہ بر رہ کند کاروانی سرائے

(انسان یہاں مسافر ہے اور مسافر کے لیے راہ پہ گھر بنانا قرین دانش نہیں۔)

۸۰۔صدائے سائل

ایک سائل بزازوں کے بازار میں یہ صدا لگا رہا تھا:

کہ اے خداوندانِ نعمت! اگر شمارا انصاف بودے و مارا قناعت رسم سوال از جہاں برخاستے۔

(کہ اے دولت والو! کہ اگر تم میں انصاف ہوتا اور ہم میں قناعت تو دنیا سے رسم گدائی اٹھ چکی ہوتی۔)

۸۱۔دو امیر زادے

مصر میں دو امیر زادے تھے۔ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا۔اور دوسرا دولت جمع کیا کرتا تھا۔ ایک علامہ بن گیا اور دوسرا حاکم مصر۔ایک مرتبہ اس حاکم نے دوسرے بھائی کو طنزاً کہا۔کہ میں مقام سلطنت تک پہنچ گیا ہوں اور تو نرا فقیہہ و عالم ہی رہا۔اس نے جواب دیا۔بھائی ذرا سوچ کر بات کہو۔مجھے اللہ نے میراث انبیاء (علم) دی ہے اور تجھے میراث فرعون، یعنی ملک مصر۔

۸۲۔درویش غیور

میں نے ایک درویش کو دیکھا۔کہ بھوک کی آگ میں جل رہا تھا۔میں نے کہا کہ اس شہر میں فلاں تونگر بڑا فیاض ہے۔اس کے پاس کیوں نہیں جاتے۔کہنے لگا:

خاموش! کہ در سختی و فقر مُر دن بہ کہ حاجت پیش کسے بُر دن۔

(خاموش! کہ فقر و فاقہ میں تباہی گدائی سے بہتر ہے۔)

۸۳۔ عرب میں طبیب

عجم کے کسی بادشاہ نے ایک ماہر طبیب کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ وہ وہاں کئی برس رہا۔ لیکن کوئی شخص برائے علاج اس کے پاس نہ آیا۔ اس نے حضور کے پاس شکایت کی۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ اس قوم کی یہ عادت ہے کہ جب تک بھوک نہ ستائے کچھ نہیں کھاتے۔ اور ابھی بھوک باقی ہوتی ہے کہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں۔ حکیم نے کہا۔ کہ ان کی صحت کا راز یہی ہے۔ اس کے بعد اجازت طلب کی اور واپس چلا گیا۔

۸۴۔ ضعیف و فربہ

دو درویش ہم سفر تھے۔ ایک پتلا دبلا تھا اور دوسرا موٹا تازہ۔ اتفاقاً دونوں جاسوسی کے الزام میں اسیر ہو گئے۔ اور جیل میں پھینک دیے گئے۔ چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ بے گناہ ہیں۔ چنانچہ حکم رہائی جاری ہو گیا۔ جب جیل کا دروازہ کھولا گیا۔ تو

قوی را دیدند مُردہ و ضعیف جاں بسلامت بُردہ

(کیا دیکھتے ہیں کہ موٹا مر چکا ہے اور پتلا صحیح و سالم ہے۔)

چوں کم خوردن طبیعت شد کسے را چو سختی پیش آید سہل گیرد
وگر تن پر دراست اندر فراخی چو تنگی بیند از سختی بمیرد

(اگر کوئی شخص عادتاً کم خور ہو۔ تو وہ سختی سہہ جاتا ہے۔
اور اگر آسودگی کی حالت میں تن پرور و آرام طلب ہو تو سختی میں مر جاتا ہے۔)

۸۵۔ عیالدار درویش

ایک درویش کا عیال زیادہ تھا۔ اور روزی کم۔ اس نے اپنے ایک دولت مند مرید سے امداد کی التجا کی۔ مرید نے وظیفہ تو بڑھا دیا۔ لیکن خود جانا چھوڑ دیا۔ سنا ہے کہ اس کے بعد درویش عموماً

کہا کرتا تھا:۔

نانم افزود آبرویم کاست
بے نوائی بہ از مذلت خواست

(میری روزی تو بڑھ گئی۔ لیکن آبرو گھٹ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ سوال کی ذلت سے بےنوائی اچھی ہے۔)

۸۶۔ عطائے اُو بلقائے اُو

ایک درویش کو کوئی ضرورت پیش آگئی۔ کسی نے کہا کہ آؤ میں تمہیں اس شہر کے ایک کریم الطبع امیر کے ہاں لے چلوں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں۔ کہ ایک صاحب اکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہونٹ لٹکے ہوئے بھویں تنی ہوئی اور چہرے پہ خشکی و ترشی محیط، درویش اسے دیکھتے ہی الٹے پاؤں لوٹا۔ ساتھی نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ کہا۔

عطائے اُو بہ لقائے اُو بخشیدم

(کہ اس کا انعام اس کی صورت پہ قربان کرتا ہوں۔)

۸۷۔ خارکش اور حاتم

حاتم سے کسی نے پوچھا۔ کہ اپنے سے بڑا باہمت کبھی دیکھا ہے؟ کہا۔ ہاں۔ ایک دن میرے ہاں بہت بڑی دعوت تھی۔ چالیس اونٹ ذبح کر رکھے تھے۔ کسی حاجت کے لیے صحرا میں گیا۔ تو ایک خارکش پہ نظر پڑی۔ جو ٹہنی جمع کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ کہ تم حاتم کے ہاں کیوں نہیں جاتے۔ وہاں آج ایک دنیا جمع ہے کہنے لگا:۔

ہر کہ نان از عملِ خویش خورد
منت حاتم طائی نہ بُرد

(جو شخص اپنی محنت سے روزی کماتا ہے۔ وہ حاتم کا احسان کبھی نہیں اٹھاتا۔)

۸۸۔ درویش برہنہ

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ننگے فقیر کے پاس سے گزرے۔ اس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس کے لیے آسودہ حالی کی دعا کریں۔ حضرت نے دعا کی اور چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد وہیں سے دوبارہ گزرے۔ تو کیا دیکھتے ہیں کہ سپاہیوں نے اس درویش کو پکڑا ہوا ہے۔ اور وہاں تماشائیوں کا ایک ہجوم ہے۔ حقیقت حال پوچھی۔ تو کسی نے کہا۔ کہ اس شخص نے شراب پی کر بدمستی میں لوگوں پہ حملے کیے۔ اور ایک کو جان سے مار ڈالا ہے۔

آں کس کہ تونگرت نمی گرد اند
او مصلحت تو از تو بہتر و اند

(جو خدا تمہیں دولت نہیں دیتا۔ وہ تمہاری بہتری کو تم سے بہتر جانتا ہے۔)

۸۹۔ بے پائی

سعدی کہتا ہے کہ مجھ پہ کوئی مصیبت ٹوٹے۔ میں زبان شکایت نہیں کھولتا البتہ ایک مرتبہ میں مجبور ہو گیا۔ وہ یوں کہ ننگے پاؤں چلنے کی وجہ سے تلوے چھلنی ہو گئے تھے۔ پاپوش خریدنے کی ہمت نہ تھی۔ اور طبیعت بڑی بیزار تھی۔ شام کو کوفہ کی بڑی مسجد میں پہنچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں ایک آدمی کے پاؤں ہی نہیں ہیں۔

سپاس نعمت حق بجا آوردم
و بر بے کفشی صبر کر دم،

میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر بجالایا اور برہنہ پائی کو گوارا کر لیا۔

۹۰۔ آخری سفر

ایک مرتبہ ایک ایسے تاجر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جس کے پاس خدمت کے لیے چالیس غلام اور بار برداری کے لیے ایک سو پچاس اونٹ تھے۔ رات کو مجھے اپنے حجرے میں لے گیا۔ اور لگا دماغ چاٹنے۔ کہ میرا اتنا مال ترکستان میں ہے اور اتنا ہندوستان میں۔ فلاں فلاں جگہ سے ہو آیا

ہوں۔ اور فلاں فلاں ملک میں ابھی جانا ہے۔ اب صرف ایک آخری سفر باقی ہے۔ اس کے بعد گھر میں بیٹھ کر اللہ کو یاد کیا کروں گا۔ میں نے پوچھا۔ وہ کونسا؟ کہا کہ ایران[1] کی فلاں چیز چین میں لے جاؤں گا۔ چین کے برتن روم[2] میں بھیجوں گا۔ روم کا ریشم ہند میں، ہند کا فولاد حلب[3] میں، حلب کا شیشہ یمن[4] میں اور یمن کی چادریں فارس میں فروخت کرنے کے بعد آرام سے گھر بیٹھ جاؤں گا۔

طویل بک بک کرنے کے بعد جب وہ تھک گیا۔ تو کہنے لگا۔ سعدی! تم بھی کچھ کہو۔ میں نے اسے یہ قطعہ سنایا:۔

آں شنید ستی کہ در صحرائے غور بار سالارے بیفتاد از ستور

گفت چشم تنگ دنیا دار را یا قناعت پر کند یا خاک گور

(شاید تم نے سنا ہو کہ ایک دفعہ غور[5] کے صحرا میں ایک تونگر خچر پر سے گر پڑا اور سخت پریشانی کی حالت میں کہنے لگا۔ کہ دنیا دار کی حریص آنکھ کو دو ہی چیزیں بھر سکتی ہیں۔ قناعت یا خاکِ گور۔)

---

[1] یہ سفر اندازاً تیس ہزار میل بنتا ہے۔
[2] ایشیائے صغیر جس کے جنوب میں شام و عراق ہیں اور شمال میں روس۔
[3] شام کا ایک شہر
[4] جنوبی عرب میں ایک چھوٹی سی سلطنت
[5] ہرات اور غزنی کے درمیان ایک علاقہ

آٹھواں باب

تربیّت

۹۱۔ پسر گودن (غبی)

ایک وزیر نے اپنا ایک نہایت نالائق، کم فہم اور کند ذہن لڑکا ایک دانشمند کے پاس تعلیم و تربیت کے لیے بھیجا۔ مدتوں وہاں رہا۔ لیکن اس پہ کچھ اثر نہ ہوا۔ بالآخر استاد نے اس لڑکے کو بایں پیغام واپس بھیج دیا۔ کہ یہ تو عاقل نہیں بنتا اور مجھے اس نے پاگل کر دیا ہے:

ہیچ صیقل نکو ندا ند کرد　　　آہنے را کہ بد گہر باشد
سگ بہ دریائے ہفتگانہ بشو　　　چونکہ ترشد پلید تر باشد
خر عیسیٰ گرش بہ مکہ برند　　　چوں بیاید ہنوز خر باشد

(اگر لوہا ناقص ہو تو اسے کوئی صیقل چمکا نہیں سکتا۔
کتے کو بے شک سات سمندروں میں نہلاؤ وہ جتنا بھیگے گا اتنا ہی پلید ہوتا جائے گا۔
عیسیٰ کا گدھا خواہ وہ مکہ پہنچ جائے۔ جب واپس آئے گا تو گدھا ہی ہوگا۔)

۹۲۔ پندِ دانشمند

ایک دانا نے اپنے بچے کو کہا۔ کہ اے نورِ نظر! علم و ہنر حاصل کر اور مال و دولت پہ اعتماد نہ کر۔ کیونکہ مال کی چوری ہو سکتی ہے۔ اور علم اک لازوال دولت ہے۔ عالم کی ہر جگہ عزت ہوتی ہے اور جاہل کی ہر جگہ ذلت۔

وقتے افتاد فتنہ در شام　　　ہر کس از گوشہ فرا رفتند
روستا زادگان دانشمند　　　بوزیری پاد شاہ رفتند
پسران وزیر ناقص عقل،　　　بہ گدائی بہ روستا رفتند

(ایک دفعہ شام پہ ایک مصیبت آن پڑی اور لوگ گھروں سے بھاگ
نکلے۔کسان کے باعلم بیٹے بادشاہ کے وزیر بن گے۔اور وزیر کی نالائق
اولاد دیہات میں بھیک مانگنے لگی۔)

۹۳۔سخت گیر استاد

مجھے ایک مدرسہ میں ایک ایسا معلم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔جو بڑا بدمزاج و سخت گیر تھا۔وہ بات بات پہ بچوں کو پیٹتا اور شکنجے میں کستا تھا۔بالآخر لوگوں نے اسے نکال دیا اور اس کی جگہ اک نہایت شریف، خاموش اور نرم طبع استاد کو لے آئے۔اب رفتہ رفتہ بچے شوخ ہونے لگے۔سبق یاد کرنا چھوڑ دیا۔تختیاں توڑ ڈالیں۔اور مدرسہ ایک بازی گاہ بن کر رہ گیا۔لوگ مجبوراً پہلے معلم کے پاس گئے اور اسے منا کر لے آئے۔

بادشاہے پسر بہ مکتب داد — لوح سیمینش در کنار نہاد
برسر لوح او نوشتہ بہ زر — جور استاد بہ زمہر پدر

(ایک بادشاہ نے اپنا بیٹا سکول بھیجا۔اس کی روپہلی تختی پر یہ بات سونے
کے پانی سے لکھی ہوئی تھی کہ استاد کی تختی باپ کی محبت سے بہتر ہے۔)

۹۴۔نذر درویش

ایک درویش کی کوئی اولاد نہ تھی۔وہ شب و روز دعائیں مانگتا تھا۔لیکن قبول نہ ہوتیں برسوں کے بعد اسے امید لگی اور اس نے نذر مانی کہ اگر اللہ نے فرزند عطا کیا تو وہ گدڑی کے سوا باقی سب کچھ اللہ کی راہ میں دے دے گا۔اس کی آرزو برآئی۔اور اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔چند برس بعد جب میں سیاحت شام سے واپس آیا اور اس درویش کو ملنے گیا تو معلوم ہوا کہ جیل میں ہے۔اہل محلہ نے مجھے بتایا کہ اس کا لڑکا بڑا بدچلن نکلا۔چند روز ہوئے ایک آدمی کو قتل کر کے کہیں بھاگ گیا ہے اور پولیس اس کے والد کو پکڑ کر لے گئی ہے۔

زنان بار دار اے مرد ہشیار اگر وقت ولادت مار زانید
ازاں بہتر بنزدیک خرد مند کہ فرزندان ناہموار زانید

(دانا کہتے ہیں کہ بدچلن اولاد کی جگہ اگر مائیں سانپ جنیں تو زیادہ بہتر ہے۔)

۹۵۔کاروانِ حج

حاجیوں کا ایک قافلہ دشتِ حجاز میں جا رہا تھا۔ کہ کسی بات پر باہم الجھ پڑے اور ایک دوسرے کے سر و بازو توڑ ڈالے۔ ایک شتر سوار یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا کہ شطرنج کا ایک پیادہ[1] میدان بساط کو طے کرنے کے بعد فرزیں بن جاتا ہے۔ لیکن یہ حاجی میدانِ حجاز کو طے کرنے کے بعد بھی غنڈے کے غنڈے ہی رہے۔

---

[1] اگر شطرنج کا پیادہ پٹنے سے بچ جائے اور وزیر کے گھر تک پہنچ جائے تو وزیر بن جاتا ہے۔

نواں باب

خموشی

۹۶۔ نقصانِ مایہ

ایک تاجر کو ہزار دینار کا خسارہ ہوا۔ بیٹے سے کہنے لگا کہ کسی سے ذکر نہ کرنا۔ بیٹے نے پوچھا۔ کہ اس بات کو چھپانے میں کیا مصلحت ہے؟

گفت تا مصیبت دو نہ شود — یکے نقصان مایہ دیگر شماتت[1] ہمسایہ

(کہا۔ تا کہ مصیبت دوہری نہ ہو جائے۔ اول نقصان مایہ دوم شادی ہمسایہ)

۹۷۔ جوانِ خردمند

ایک باعلم و ہنرمند نوجوان علمی محفلوں میں اکثر شامل ہوتا۔ لیکن از اول تا آخر چپ رہتا۔ کسی نے پوچھا کہ اس قدر عالم ہونے کے باوجود تم خاموش کیوں رہتے ہو۔ کہنے لگا۔ کہ اگر بولوں تو ڈرتا ہوں کہ اہل محفل کوئی ایسی بات نہ پوچھ لیں جو میں نہیں جانتا۔ اور سر محفل رسوائی ہو۔

۹۸۔ دانائے ناداں

جالینوس[2] نے ایک نادان کو دیکھا کہ ایک دانا کو پیٹ رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر جالینوس نے کہا کہ اگر یہ دانا در حقیقت دانا ہوتا تو اس نادان سے نہ پٹتا۔

۹۹۔ حسن میمندی

حسن میمندی (وزیر محمود غزنوی) سے کسی نے پوچھا۔ کہ آج محمود نے خلوت میں تم سے کیا باتیں کیں؟ کہا اس نے تم سے بھی تو مشورہ کیا ہوگا۔ کہنے لگا۔ یہ مقام مجھے کہاں حاصل جو باتیں وہ آپ سے کرتا ہے کسی اور سے قطعاً نہیں کرتا۔ کہا۔ اسی اعتماد پہ کرتا ہے کہ میں کسی سے نہیں کہوں گا۔ تو پھر تم کیوں پوچھتے ہو؟

---

[1] شماتت = خوش ہونا، بغلیں بجانا

[2] یونان کا مشہور حکیم جو پہلی صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ ایشیائے صغیر کے ایک شہر فرغاموس کا رہنے والا مشہور قیصر روم نیرو (۵۴-۶۸ء) کا ہم عصر

۱۰۰۔ بدآواز مؤذّن

ایک مؤذن کی آواز اس قدر مکروہ تھی۔ کہ جب وہ بانگ دیتا تو لوگ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ تنگ آکر مسجد کے متولی نے اسے بلایا اور کہا کہ اس مسجد کا قدیمی مؤذن واپس آگیا ہے۔ اس لیے تم کہیں اور چلے جاؤ اور یہ لو دس دینار بطور انعام۔ مؤذن خوشی خوشی وہاں سے چلا آیا اور چند دنوں کے بعد واپس آگیا۔ اور کہنے لگا کہ اب وہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیس دینار لو اور یہاں سے چلتے بنو۔ متولی ہنس کر کہنے لگا۔ خبردار بیس پہ فیصلہ نہ کرنا دو چار اذانیں اور دو وہ پچاس پہ آجائیں گے۔

۱۰۱۔ بدآواز قاری

ایک شخص کی آواز نہایت بری تھی۔ اور وہ بہت اونچی آواز میں قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک دن ایک صاحب دل نے پوچھا۔ کہ کیا تمہیں اس تلاوت کا کچھ معاوضہ بھی ملتا ہے؟ کہا، کچھ نہیں۔ محض خدا کے لیے پڑھا کرتا ہوں۔ اس نے کہا۔ خدا کے لیے یہ سلسلہ بند کر دو۔ ورنہ دنیا اسلام سے بھاگ جائے گی۔

گر تو قرآن بدیں نمط خوانی،
ببری رونق مسلمانی،

(اگر تم قرآن اس انداز سے پڑھو گے تو اسلام کا جنازہ نکل جائے گا۔)

دسواں باب

بُلند اخلاقی

۱۰۲۔ چور اور پارسا

ایک چور ایک پارسا کے گھر میں جا گھسا۔ ہر طرف نظر ڈالی۔ لیکن کچھ نہ ملا۔ جب مایوس ہو کر لوٹنے لگا۔ تو پارسا نے وہ گلیم جس پہ سویا ہوا تھا۔ اس کی راہ میں پھینک دی۔ تا کہ خالی ہاتھ نہ جائے۔

شنیدم کہ مردان راہ خدا　　دل دشمناں ہم نکردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام　　کہ بادوستانت خلاف است و جنگ

(سنا ہے کہ اللہ کے بندے دشمنوں کو بھی دکھ نہیں دیتے۔ لیکن تمہیں یہ مقام کیسے مل سکتا ہے۔ کہ تم دوستوں سے بھی لڑتے رہتے ہو۔)

۱۰۳۔ شب بیداری

میں بچپن میں رات بھر عبادت و تلاوت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اپنے والد کے ساتھ مسجد میں مصروف عبادت تھا۔ اور ایک گروہ ہمارے ارد گرد خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے والد سے کہا۔ کہ یہ لوگ کس قدر بد بخت ہیں کہ اللہ کو بھول کر سوئے ہوئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا کہ مر چکے ہیں۔ حضرت والد نے فرمایا:

اگر تو نیز بخفتی ازاں بہ کہ در پوستین خلق افتی

(کہ اے جان پدر! اگر تم بھی سو جاتے اور لوگوں کی پوستین نہ پھاڑتے (یعنی غیبت نہ کرتے) تو بہتر ہوتا۔)

۱۰۴۔ غلط فہمی

ایک محفل میں لوگ ایک بزرگ کی مبالغہ آمیز تعریف کر رہے تھے۔ وہ بزرگ سنتا رہا اور

بالآخر یوں گویا ہوا۔

من آنم کہ من دانم۔

(میں کیا ہوں؟ اسے صرف میں ہی جانتا ہوں۔)

۱۰۵۔ زخمِ پلنگ

کسی دریا کے کنارے میں نے ایک پارسا کو دیکھا کہ جسم پہ زخمِ پلنگ تھا اور اس حالت میں بھی اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ کونسا مقامِ شکر ہے؟ کہنے لگا۔

شکر آں کہ بہ مصیبتے گرفتارم نہ بہ معصیتے

(اس بات کا شکر کہ گرفتارِ مصیبت ہوں نہ کہ اسیرِ معصیت "گناہ")

۱۰۶۔ شاہ و پارسا

ایک بادشاہ نے ایک پارسا سے پوچھا۔ کہ کیا میں بھی آپ کو کبھی یاد آتا ہوں۔ کہا۔ ہاں۔ جب میں خدا کو بھول جاتا ہوں۔

۱۰۷۔ الٹی بات

ایک شخص نے خواب میں دیکھا۔ کہ بادشاہ بہشت میں ہے۔ اور پارسا دوزخ میں اس نے کسی سے سبب پوچھا۔ تو جواب ملا کہ یہ بادشاہ فقیروں سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس لیے جنت میں جا پہنچا۔ اور وہ فقیر شاہی درباروں کا گرویدہ تھا۔ اس لیے جہنم رسید ہوا۔

۱۰۸۔ حالِ مست

ہمارا قافلہ کوفہ سے روانہ ہوا۔ تو ایک مست قلندر بھی ہمارے ساتھ چل پڑا۔ ایک شتر سوار نے اسے آواز دی کہ واپس جاؤ۔ ورنہ سفر میں مر جاؤ گے۔ اس نے پرواہ نہ کی اور گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب ہم اگلی منزل پہ پہنچے۔ تو اس شتر سوار کو موت نے آلیا۔ وہ مست اس کی بالین پہ گیا۔ اور بولا۔

ما بہ سختی نہ مردیم و تو بر بختی[1] بمردی۔

---

[1] اُونٹ کی ایک قسم جسے بختی کہتے ہیں۔

(ہم سختی میں جیتے رہے اور تو اونٹ پہ مر گیا۔)

۱۰۹۔ بدظنی

ایک بدکار تائب ہوگیا۔ لیکن زبان خلق سے نہ بچ سکا۔ لوگ یہی کہتے رہے کہ مکر کر رہا ہے۔ آخر تنگ آکر اپنے مرشد کے پاس گیا اور صورت حال بیان کی۔ مرشد نے کہا:۔

شکر ایں نعمت چگو نہ گزاری   کہ بہتر ازانی کہ می پندارندت

(اللہ کا شکر ادا کرو۔ کہ جو کچھ تمہیں لوگ سمجھتے ہیں تم اس سے بہتر ہو۔)

۱۱۰۔ جانشینِ شاہ

ایک بادشاہ کا وقت مرگ قریب آیا۔ تو اس نے وصیت کی۔ کہ جو شخص کل سب سے پہلے شہر میں داخل ہو۔ اسے بادشاہ بنالیا جائے۔ دوسرے روز شہر میں سب سے پہلے ایک بھکاری آیا۔ جسے امرائے دولت ساتھ لے گئے اور تاج وتخت کا مالک بنا دیا۔ کچھ عرصے کے بعد نظام ملک میں خلل آگیا۔ لوگ بگڑ گئے۔ راہیں ویران اور سرحدیں پریشان ہوگئیں۔ انھی دنوں اس کا ایک پرانا ساتھی دربار میں آنکلا۔ اس شان وشوکت کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا اور مبارک دی۔ اس نے کہا کہ یہ جائے تہنیت (مبارک) نہیں بلکہ مقام تعزیت (ماتم) ہے:

کہ آنکہ غم نانے داشتم وامروز غم جہانے۔

(کہ پہلے مجھے صرف ایک نان کا غم تھا اور آج پورے جہان کا۔)

۱۱۱۔ فکرِ معاش

ایک بادشاہ نے ایک پارسا سے پوچھا۔ کہ وقت کیسے کٹ رہا ہے۔ کہا رات دعائے حاجات میں گزر جاتی ہے اور دن فکر اخراجات (روزی) میں۔ بادشاہ اشارے کو سمجھ گیا۔ اور فرمایا کہ اس کا وظیفہ باندھ دو۔ تاکہ عیال کا بوجھ اس کے دل سے اٹھ جائے۔

۱۱۲۔ سعادت

بیٹا باپ سے کہنے لگا۔ کہ مجھے ان واعظوں اور صوفیوں کی صحبت پسند نہیں۔ کہ کہتے ہیں کچھ

اور کرتے کچھ اور ہیں۔ بیٹا ان لوگوں سے فیض پانے کے لیے عقیدت و محبت کی ضرورت ہے۔
جس سے تم محروم ہو۔

تا ارادت نیاوری سعادت نہ بُری۔
(جب تک کہ ان کی خدمت میں ارادت (عقیدت) نہیں لاؤ گے۔
سعادت نہیں پاؤ گے۔)

۱۱۳۔ عالم[1] و عابد

ایک صاحب دل خانقاہ سے نکل کر مدرسہ میں آ گیا۔ میں نے پوچھا۔ کہ تمہیں اہل علم کی کونسی بات پسند آئی ہے۔ کہ تم نے زاہدوں کا مسلک ترک کر دیا ہے۔ کہنے لگا۔

گفت او گلیم خویش بروں می بُرد زموج
دین جهد می کند کہ بگیرد غریق را

(کہ عابد صرف اپنی گلیم (گدڑی) کو لہروں سے بچاتا ہے اور عالم ڈوبنے
والوں کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔)

۱۱۴۔ پہلوان

ایک دانا پہلوان کو اس حال میں دیکھا کہ وہی تباہی بک رہا تھا۔ اور منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا۔ پوچھا کیا ہوا۔ کسی نے کہا کہ فلاں نے اسے گالی دی ہے۔ فرمایا۔

کہ ایں فرومایہ ہزار من سنگ برمی دارد و طاقت سخنے نمی آرد۔
(کہ یہ کمینہ ہزار من کا پتھر تو اٹھا لیتا ہے۔ لیکن ایک چھوٹی سی بات
برداشت نہیں کر سکتا۔)

۱۱۵۔ نگاہِ حقارت

ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے درویشوں کے ایک گروہ کو حقارت سے دیکھا۔ ان میں سے ایک

[1] عالم اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور عابد اپنی عبادت سے خود فائدہ اٹھاتا ہے۔ عالم کی جگہ مدرسہ ہے اور عابد کی خانقاہ۔

بول اٹھا:۔

اے ملک مادریں دنیا بجیش ازتو کم تریم۔ بہ عیش ازتو خوشتریم۔ بہ مرگ برابریم و بہ قیامت بہتریم۔

(کہ اے بادشاہ! بیشک ہماری سپاہ تم سے کم تر ہے۔ لیکن ہم دنیا میں تم سے خوش تر ہیں۔ موت کے وقت برابر اور قیامت میں انشاء اللہ بہتر ہوں گے۔)

۱۱۶۔ سخاوت وشجاعت

ایک دانا نے کسی سے پوچھا۔ کہ سخاوت وشجاعت میں سے بہتر کون سی ہے۔ کہا۔ جس کے پاس سخاوت ہے۔ اسے شجاعت کی ضرورت نہیں۔

نبشت است برگور بہرام گور
کہ دست کرم بہ ز بازوے زور

بہرام[1] گور کی تربت پہ یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ کہ دست کرم طاقت ور بازد سے بہتر ہے۔

---

[1] ساسانی خاندان ۲۲۶ھ-۶۵۲ء میں بہرام نام کے پانچ بادشاہ تھے۔ آخری بہرام جو اس سلسلے کا تیرھواں بادشاہ تھا (کل ۲۸) بہرام گور کہلاتا تھا۔ اس نے اندازاً ۴۰۱ء سے ۴۲۴ء تک حکومت کی۔

گیارھواں باب

اقوالِ زرّیں

۱۱۷

موسیٰ علیہ السلام نے مصر کے سب سے بڑے دولت مند قارون کو کہا۔ کہ اللہ نے تم کو بہت کچھ دیا ہے۔ تم کچھ دنیا کو بھی دیا کرو۔

نشنید۔ عاقبتش شنیدی۔

(اس نے نہ سنا۔ اس کا انجام سنا؟)

۱۱۸

دو آدمیوں کی کوشش رائیگاں جاتی ہے۔

یکے آنکہ اندوخت و نخورد و دیگر آنکہ آموخت و نکرد

(ایک وہ جس نے دھن جمع کیا اور نہ کھایا۔ دوسرا وہ جس نے پڑھا۔ اور عمل نہ کیا۔)

۱۱۹

عالم نا پرہیزگار ، کور شعلہ دار است

(بدکار عالم ایک اندھا ہے۔ جس کے ہاتھ میں مشعل ہو۔)

۱۲۰

ملک از خردمنداں جمال گیرد و دین از پرہیزگاراں کمال یابد۔

(ملک کا جمال داناؤں سے ہے۔ اور دین کا کمال پرہیزگاروں سے۔)

۱۲۱

راز کی ہر بات دوست کو نہ بتاؤ۔ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ دشمن بن جائے
(دشمن کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ دوست ہو جائے۔)

۱۲۲

اگر دو آدمی ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں۔ تو تمہارا وطیرہ ایسا ہو کہ اگر
کل ان میں صلح ہو جائے تو تمہیں شرمسار نہ ہونا پڑے۔

۱۲۳

ہر کہ بدے را بکشد خلق از بلائے وے برہاند وے را از عذاب خدا
(جو شخص کسی بد کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دنیا کو اس کے عذاب سے اور اسے
خدائی عذاب سے بچاتا ہے۔)

۱۲۴

نہ چنداں درشتی کن کہ از تو سیر گردند و نہ چنداں نرمی کہ بر تو دلیر
(نہ اتنی سختی کرو کہ لوگ تم سے سیر (تنگ) ہو جائیں۔ اور نہ اتنی نرمی کہ دلیر
ہو جائیں۔)

۱۲۵

دو شخص ملک و مذہب کے دشمن ہیں۔ اول بادشاہ بے حلم۔ دوم عابد بے علم۔

۱۲۶

ایک مرتبہ ایک مسلمان اور ایک یہودی میں تکرار ہو گئی۔ مسلمان کہنے لگا
کہ اگر میری یہ دستاویز جعلی نکلے تو خدا مجھے یہودی بنا دے۔ یہودی نے
کہا۔ تورات کی قسم کہ میں سچا ہوں۔ اور اگر جھوٹ بولوں تو خدا مجھے

مسلمان کر کے مارے۔

گر از بسیط زمین عقل منعدم گردد
بخود گماں نہ برد ہیچ کس کہ نادانم

(اگر دنیا سے عقل سراسر معدوم ہو جائے تو پھر بھی کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ میں نادان ہوں۔)

۱۲۷

دہ آدمی بر سفرہ بخورند
و دو سگ بر مردارے بسر نبرند

(ایک دسترخوان پر دس آدمی کھا لیتے ہیں۔ لیکن ایک مردار پہ دو کتے گزارہ نہیں کر سکتے۔)

۱۲۸

ہر کہ حال توانائی نکوئی نہ کند، در وقت ناتوانی سختی بیند

(جو آدمی اچھے وقتوں میں نیکی نہیں کرتا۔ وہ برے وقتوں میں دکھ اٹھاتا ہے۔)

۱۲۹

ہر چہ زود بر آید، دیر نہ پاید

(جو چیز جلد حاصل ہو۔ وہ جلد چلی جاتی ہے۔)

۱۳۰

کارہا بصبر بر آید و مستعجل بہ سر در آید۔

(کام صبر سے نکلتے ہیں اور جلد باز سر کے بل گرتے ہیں۔)

۱۳۱

نادان کے لیے بہترین چیز خاموشی ہے۔ اگر وہ اتنی سی بات جانتا تو نادان نہ ہوتا۔

خرے را ابلہے تعلیم می داد | برو بر صرف کردے سعی دائم
حکیمے گفتش اے ناداں چہ کوشی | دریں سودا بترس از لوم لائم
نیا موزد بہائم از تو گفتار | تو خاموشی بیاموز از بہائم

(ایک احمق ایک گدھے کو بڑی محنت سے تعلیم دے رہا تھا۔ کسی دانا نے کہا۔ کہ وقت ضائع نہ کرو۔ اور اس بیہودہ شغل سے باز آؤ۔ یہ گدھا تم سے کچھ نہیں سیکھے گا۔ کیا اچھا ہو کہ تم اس سے خموشی سیکھ لو۔)

۱۳۲

ہر کہ بابداں نشیند نکوئی نہ بیند
(جو شخص بروں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ کبھی سکھ نہیں پاتا۔)

۱۳۳

بے نماز کو ادھار مت دو۔

کو فرض خدا نمی گزارد | از قرض تو نیز غم ندارد
کہ جو شخص خدا کا فرض ادا نہیں کرتا۔ وہ تمہارا قرض بھی ادا نہیں کرے گا۔

۱۳۴

سالک (زاہد) بے علم ایک مرغ بے پر ہے اور عالم بے عمل ایک درخت بے ثمر۔

۱۳۵

ہر کہ سخن نہ سنجد از جواب بر نجد

جو آدمی بات کو سوچتا نہیں۔ وہ جواب پہ بگڑتا ہے۔

۱۳۶

انسان اشرف کائنات ہے اور کتا اذل (ذلیل ترین) موجودات۔ لیکن اس بات پہ سب متفق ہیں۔

کہ سگ حق شناس بہ از آدم ناسپاس

(کہ سگ حق شناس مرد بے سپاس سے بہتر ہے۔)

۱۳۷

خداوند تبارک وتعالیٰ می بیند و می پوشد و ہمسایہ نمی بیند و می خروشد

اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے اور پھر پردہ ڈالتا ہے۔ لیکن ہمسایہ بن دیکھے شور مچاتا ہے (یعنی جھوٹے الزام لگاتا ہے)

۱۳۸

ہر کہ بہ زیردستاں نہ بخشاید　　　بہ جور زبردستاں گرفتار آید

(جو شخص زیردستوں پہ رحم نہیں کھاتا۔ وہ زبردستوں سے مار کھاتا ہے۔)

۱۳۹

ایک دانا سے کسی نے پوچھا۔ کہ فضیلت تو دائیں ہاتھ کو حاصل ہے۔ لوگ انگشتری بائیں ہاتھ میں کیوں پہنتے ہیں؟ کہا کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اہل فضیلت ہمیشہ محروم رہتے ہیں؟

۱۴۰

بادشاہوں کو وہی شخص نصیحت کر سکتا ہے۔

کہ بیم سر ندارد، یا امید زر۔

جسے نہ سر کا ڈر ہو نہ تمنائے زر۔

رومیؒ

نام ونسب وغیرہ

محمد نام، جلال الدین لقب اور مولائے روم عرف، والد کا نام بھی محمد تھا اور لقب بہاء الدین ولد۔ دادا حسین بن احمد بن قاسم تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتا ہے۔

رومی کے والد علم وتقویٰ کی وجہ سے مقتدایان دہر میں شمار ہوتے تھے۔ اور سلطان علاؤالدین محمد خوارزم شاہ (سلطنت ۵۹۶ھ۔ ۶۱۷ھ = ۱۱۹۹ء۔ ۱۲۲۰ء) ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ صبح سے دوپہر تک درس دیتے۔ بعد از ظہر ایک عام محفل میں مختلف مسائل پہ گفتگو کرتے اور جمعہ کے دن وعظ فرماتے تھے۔

ہجرت

رومی کے آباؤ اجداد بلخ میں مقیم تھے۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ آپ کے والد ترک وطن پہ مجبور ہو گئے۔ عام روایت یہ ہے کہ جب تاتاری ۶۱۷ھ = ۱۲۲۰ء میں خوارزم[1] پر حملہ آور ہوئے اور ہر طرف قتل وغارت کا بازار گرم ہو گیا۔ تو بہاء الدین کو بلخ چھوڑنا پڑا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ جب سارا ملک بہاء الدین کا مرید ہو گیا۔ تو محمد خوارزم شاہ اندر ہی اندر جلنے لگا۔ جب یہ خبریں بہاء الدین تک پہنچیں۔ تو وہ ترک وطن پہ آمادہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ بہاء الدین مسلک کے لحاظ سے امام غزالی (۱۰۵۸ء۔ ۱۱۱۱ء) کے پیرو اور فلسفۂ یونان کے دشمن تھے۔ دوسری طرف امام فخر الدین رازیؒ ۵۴۴ھ۔ ۶۰۶ھ = ۱۱۵۰ء۔ ۱۲۱۰ء) جو بہاء الدین کے ہم عصر اور دربار خوارزم سے وابستہ تھے۔ اس فلسفہ کے پرجوش مبلغ تھے۔ ممکن ہے کہ رازیؒ نے بھی محمد خوارزم شاہ کی بدگمانی میں کچھ اضافہ کیا ہو۔ بہر حال ایک روز بہاء الدین تین سو مریدوں کے ساتھ شہر سے نکلے اور منزل بہ منزل بغداد کی طرف چل دیئے۔ ۶۱۰ھ = ۱۲۱۴ء میں نیشاپور پہنچے۔ خواجہ فریدالدین عطار (۵۳۰ھ۔

---

[1] خوارزم۔ روسی ترکستان میں ایک جھیل ارال کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے جنوب میں ایک علاقہ خوارزم کہلاتا ہے۔ اس کے دارالحکومت کا نام بھی خوارزم یا خیوہ ہے۔

۶۲۷ھ = ۱۱۳۶ء۔۱۲۳۰ء) سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت رومی (پ ۶۰۴ھ = ۱۲۰۸ء) کی عمر چھ برس کی تھی۔ بچے کی روش اور کشادہ جبیں، تیکھے خدوخال اور چمکیلی آنکھوں سے عطار نے اندازہ لگا لیا۔ کہ یہ آگے چل کر اک بڑی چیز بنے گا۔ بشرطیکہ اس کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی نہ ہوئی۔ چنانچہ اس نے بہاؤالدین کو اس جوہر قابل کی موزوں پرورش کے متعلق تاکید کی۔ اور اس کے بعد اپنی مثنوی اسرار نامہ رومی کو عنایت کی۔

نیشاپور سے یہ قافلہ بغداد پہنچا۔ وہاں مدتوں قیام رہا۔ اس کے بعد حرمین کا ارادہ کیا۔ حج سے فارغ ہو کر ملاطیہ[1] میں وارد ہوئے۔ وہاں چار سال ٹھہرے۔ پھر لارندہ (زارندہ) کی طرف چل دیئے۔ جو قونیہ سے چالیس میل جنوب میں واقع ہے۔ اور وہاں سات سال قیام کیا۔ اس وقت ایشیائے خورد (ارض روم) پر سلجوقیوں کی ایک شاخ مسلط تھی جس کے سترہ سلاطین ۴۷۰ھ سے ۷۰۰ھ = ۱۰۷۷ء سے ۱۳۰۰ء تک حکمران رہے۔ ان کا پایہ حکومت قونیہ تھا۔ ان دنوں اس سلسلے کا بارہواں بادشاہ علاؤالدین کیقباد (سلطنت ۶۱۶ھ۔۶۳۴ھ = ۱۲۱۹ء۔۱۲۳۶ء) تخت نشین تھا۔ اس نے ایلچیانِ خاص بھیج کر بہاؤالدین کو قونیہ آنے کی دعوت دی۔ جب وہ قونیہ کے قریب پہنچے تو کیقباد ارکان دولت کے ساتھ پیشوائی کو نکلا۔ بڑی شان سے انھیں شہر میں لایا۔ ایک عمدہ مکان میں اتارا۔ اور تمام ضروریات حیات کا انتظام کر دیا۔

تذکرہ نگاروں کا اندازہ یہ ہے کہ مولانا قونیہ میں ۶۲۴ھ = ۱۲۲۷ء کے اواخر میں پہنچے تھے۔ تین برس تک دنیا کو فیض پہنچانے کے بعد ۶۲۸ھ = ۱۲۳۱ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

برہان الدینؒ سے فیض

بہاؤالدین کی وفات کے بعد برہان الدین محقق ترمذی (م ۱۲۴۰ء) قونیہ میں آ نکلے۔ یہ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انھوں نے رومی کو مجاہدہ و ریاضت کا خوگر بنایا۔ اور شمس تبریز کے لیے راہ ہموار کر دی۔

سفر دمشق

چونکہ قونیہ میں اعلیٰ تعلیم کا انتظام تسلی بخش نہیں تھا۔ اس لیے رومی شام کی طرف چلے گئے۔ پہلے حلب اور پھر دمشق میں وارد ہوئے۔ وہاں ہسپانیہ کے مشہور مفکر محی[2] الدین ابن العربی بھی

[1] ملاطیہ = ایشیائے خورد کا ایک شہر، شام کی سرحد سے اندازاً پچاس میل شمال میں۔
[2] ابن العربی کی وفات ۱۲۴۰ء کو دمشق میں ہوئی اور وہیں مدفون ہیں۔

موجود تھے۔ قیاس یہ ہے کہ رومی ان سے بھی فیض یاب ہوئے ہوں گے۔ دمشق میں پورے سات سال گزارنے کے بعد رومی قونیہ لوٹ آئے۔

رومیؒ وتبریزیؒ کی ملاقات

شمس بن علاء الدین تبریزی بابا کمال جندیؒ کے مرید تھے۔ اور ہمیشہ سیاحت میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ پیر نے حکم دیا کہ قونیہ میں جاؤ اور وہاں ایک دل سوختہ رہتا ہے۔ اسے اور گرم کر آؤ۔ چنانچہ ۶۴۲ھ = ۱۲۴۵ء میں شمس قونیہ پہنچے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ سیدھے مولانا کے مدرسے میں چلے گئے۔ اس وقت آپ ایک حوض کے کنارے طلبہ کو درس دے رہے تھے۔ پاس کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بعد از درس آپ نے شمس کو دیکھا تو سہی۔ لیکن توجہ نہ دی۔ پھٹے پرانے کپڑے اور گرد آلود بال دیکھ کر یہی سمجھے ہوں گے۔ کہ کوئی گدا ہے۔ یا مست سیلانی۔ ادھر شمس تعارف کے لیے مضطرب تھے۔ کتابوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ رومی نے غرور علم میں فرمایا۔ چیزے است کہ تو نمی دانی۔ یہ وہ چیز ہے جسے تو نہیں جانتا۔ فقر جلال میں آ گیا۔ کتابیں اٹھا کر حوض میں پھینک دیں۔ اس پر مولانا سخت گھبرائے اور تلملائے۔ تو اس نے کتابیں حوض سے نکال کر دوبارہ سامنے رکھ دیں۔ ویسی کی ویسی خشک۔ انتہائی حیرت میں رومی نے پوچھا۔ کہ یہ کیا ہے فرمایا چیزیست کہ تو نمی دانی۔ یہ وہ چیز ہے جسے تم نہیں جانتے۔ مولانا اٹھ کر شمس سے بے ساختہ لپٹ گئے۔ طویل معانقہ کے بعد جب وہ الگ ہوئے۔ تو رومی اک نئی دنیا میں پہنچ چکے تھے۔

شمس تبریزی درآمد در دلم بزمے نہاد
از شراب عشق حق بنگر در و دیوار مست (رومی)

درس و وعظ چھوٹ گیا۔ لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ دونوں صلاح الدین زرکوب کے حجرے میں چلہ کش ہو گئے۔ اور چھ ماہ کے بعد باہر نکلے۔ مولانا کے طلبہ میں جو آپ کے درس سے محروم ہو گئے تھے۔ نیز عوام میں، جن کا منبر و محراب اجڑ گیا تھا۔ شدید اشتعال پیدا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک گروہ نے شمس تبریزی پہ حملہ کر دیا۔ اور وہ قونیہ چھوڑ کر دمشق چلے گئے۔ اب مولانا کا یہ حال تھا کہ

کھانا پینا رہ گیا۔لوگوں کا خیال تو یہ تھا کہ شمس کے جانے کے بعد رومی پرانے مشاغل میں مصروف ہو جائیں گے۔لیکن جب ان کی جان تک خطرے میں پڑ گئی۔تو ایک وفد شمس کو واپس لانے کے لیے دمشق روانہ ہوا۔جب یہ قافلہ واپس آیا۔تو مولانا شہر سے باہر استقبال کو گئے۔اپنے پیر کو بڑی شان سے شہر میں لائے۔اس کے بعد مہینوں ذوق وشوق کی صحبتیں رہیں۔لیکن لوگوں میں دوبارہ اشتعال پیدا ہو گیا۔کسی نے سوچا کہ اگر شمس کو قتل کر دیا جائے۔تو شاید مولانا وعظ وتدریس کی طرف لوٹ آئیں۔ایک دن پھر ایک ہجوم نے شمس پہ حملہ کیا۔سر پہ سخت چوٹ آئی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔اور ۶۴۵ھ = ۱۲۴۷ء میں رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

ایک خط

جب وہ وفد شمس کو منانے کے لیے دمشق گیا تھا۔تو مولانا نے قائد وفد سلطان ولد کو اپنے مرشد کے نام ایک منظوم خط بھی دیا تھا۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

که ازاں دم که تو سفر کر دی   از حلاوت جدا شدیم چو موم

بے حضورت سماع نیست حلال   ہمچو شیطان طرب شدہ مرحوم

شام از نور صبح روشن باد

اے بہ تو فخر شام و ارمن و روم

کہ جب سے آپ گئے ہیں۔میں اس موم کی طرح ہوں جو شہد سے جدا ہو جائے۔آپ کی غیر موجودگی میں قوالی کو حرام سمجھتا ہوں۔میرا ذوق طرب میرے شیطان کی طرح ختم ہو چکا ہے۔اے شام، روم اور آرمینیہ کے فخر! خدا کرے کہ میری شام تیری صبح کے جلووں سے روشن ہو۔

اس کے بعد

حضرت تبریزی کی شہادت کے بعد رومی کی مستی میں تلخی وغم بھی شامل ہو گئی۔وہ مست ذات تو تھے ہی۔اب ملول بھی رہنے لگے۔اب ان کی مصروفیات دو ہی قسم کی تھیں۔عبادت ومحویت یا

فراقِ شمس میں غزل پہ غزل۔ تیرہ برس تک وہ کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اس عرصے میں ان کے قلم سے اندازاً پچاس ہزار دردناک اشعار نکلے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

(۱)

در ہوایت بے قرارم روز و شب — سرز پایت بر ندارم روز و شب

تا مہار عاشقان در دست تست — درمیان آں قطارم روز و شب

نیست عیدم منحصر برماہ چرخ — من زماہت عید دارم روز و شب

میں تیری محبت میں دان رات بے قرار رہتا ہوں۔ اور میرا سر تیرے قدموں پہ جھکا ہوا ہے۔

جب تک عاشقوں کی مہار تیرے ہاتھ میں ہے۔ میں دن رات قطار میں چلتا رہوں گا۔

میری عید کا انحصار آسمانی چاند پہ نہیں۔ بلکہ میرا چاند تو ہے اور میرے دن رات عید ہیں۔

(۲)

بجان تو کہ مرواز میان کار مخسپ — زعمر یک شبہ کم گیر زندہ دار و مخسپ

ہزار شب زبرائے ہوائے خود خسپی — یکے شبے چہ شود از برائے یار مخسپ

برائے یار لطیفے کہ شب نمی خسپد — موافقت کن و دل رابد و سپار مخسپ

تمہیں اپنی جان کی قسم! کہ زندگی کو ضائع نہ کرو اور جاگتے رہو۔

عمر سے ایک رات کم سہی۔ رات کو زندہ رکھو اور مت سوؤ۔

اپنی خاطر تم نے ہزاروں راتیں نیند میں گزار دیں۔ اگر یار کی خاطر ایک رات ہی جاگتے رہو تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

تمہارا یار جسم و مادہ کی آلائشوں سے پاک ہے۔ اور سدا بیدار رہتا ہے۔

یار کے نقشِ قدم پہ چلو اور مت سوؤ۔

(۳)

ما زندہ بہ نور کبریائیم بے گانہ و سخت آشنائیم
مغ توبہ کند ز سجدۂ نار گرما رخ خود بہ او نمائیم
سوزد بالِ عقاب و سیمرغ گرما پروبال خود کشائیم
محویم بہ حسن شمس تبریز
او محو ازل نہ او نہ مائیم

ہم خدا کے نور سے زندہ ہیں۔ یہ نور ہم سے جدا بھی۔ لیکن ہم اس سے آشنا ہیں۔

اگر ہم کسی آتش پرست کو اپنا چہرہ دکھائیں۔ تو وہ آتش پرستی سے توبہ کر لے۔

اگر ہم بلند فضاؤں میں اڑنے لگیں۔ تو عقاب و سیمرغ کو پرواز کی ہمت نہ پڑے۔ اور وہ یوں گوشہ نشین ہو جائیں جیسے ان کے پر جل چکے ہوں۔

ہم شمس تبریز کے حسن میں گم ہیں اور وہ حسن ازل میں محو۔ یعنی نہ اس کی ہستی باقی ہے۔ نہ ہماری۔

صلاح الدین زرکوب

مولانا گھر سے بہت کم نکلتے تھے۔ ایک روز کسی ضرورت کے لیے باہر آئے۔ یہ غالباً ۶۵۴ھ کا واقعہ ہے اور ایک دوکان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ تو قدم رک گئے۔ یہ صلاح الدین زرکوب کی دوکان تھی۔ وہ اس وقت چاندی کے ورق کوٹ رہا تھا۔ ہتھوڑے کی چوٹ میں کچھ ایسا تال تھا۔ کہ مولانا ناچنے لگ گئے۔ گھنٹوں یہ کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد صلاح الدین دوکان سے باہر آ گئے اور دامن جھاڑ کر مولانا کے ساتھ ہو لیے۔ یہ صحبتیں دس برس تک جاری رہیں۔ بالآخر ۶۶۴ھ = ۱۲۶۶ء میں زرکوب کا انتقال ہو گیا اس پر مولانا نے ایک دردناک غزل لکھی۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

اے ز ہجراں در فراقت آسمان بگریستہ
دل میان خون نشستہ عقل و جاں بگریستہ

اے صلاح الدین! تمہاری جدائی میں آسمان رویا، دل لہو میں ڈوب گیا اور عقل وجان نے ماتم کیا۔

حسام الدین

مولانا کے عقیدت مندوں میں حسام الدین حسن بن محمد بن حسن (م ۶۸۳ھ = ۱۲۸۳ء) اس قدر ممتاز تھے۔ کہ مثنوی میں جابجا ان کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً

شہ حسام الدین کہ نور انجم است
طالب آغاز سفر پنجم است

شہ حسام الدین جو ستاروں کا نور ہے۔ مثنوی کے دفتر پنجم لکھنے کا تقاضہ کر رہا ہے۔

صلاح الدین کے بعد حسام الدین مولانا کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ اور مثنوی انھی کی مسلسل تحریک وترغیب کا نتیجہ ہے۔ تذکروں میں مذکور ہے۔ کہ رومی کے شاگرد اور مرید روحانی تسکین کے لیے سنائی (۵۲۵ھ=۱۱۳۱ء) کی الٰہی نامہ اور عطار (۶۲۷ھ=۱۲۳۰ء) کی منطق الطیر پڑھتے تھے۔ اس پر حسام الدین نے بار بار مولانا سے تقاضا کیا۔ کہ وہ منطق الطیر کی بحر میں ایک مثنوی لکھیں۔ کہاں تک انکار کرتے۔ آخر مان گئے اور ۶۵۸ھ = ۱۲۶۰ء میں اس کتاب عظیم کا آغاز ہوا۔

ستون

دولت شاہ سمرقندی (م ۹۰۱ھ = ۱۴۹۶ء) اپنی کتاب تذکرہ میں لکھتے ہیں۔ کہ مولانا کے گھر میں ایک چوبی ستون تھا۔ جب طبیعت مائل بہ شعر ہوتی۔ تو اس ستون کو پکڑ کر ارد گرد گھومنا شروع کر دیتے۔ اور ساتھ ساتھ فی البدیہہ اشعار بھی کہتے جاتے۔ حسام الدین ان اشعار کو پہلے سریلی

آواز میں دہراتے اور پھر لکھ لیتے۔ مثنوی کے تمام دفاتر اسی طرح لکھے گئے ہیں۔ مولانا کو نہ نظر ثانی کی عادت تھی نہ شعر میں ردو بدل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ہموار نہیں۔ کہیں فصاحت کے انتہائی نقاط پہ پہنچ جاتا ہے۔ اور کہیں سلاست و روانی تک سے محروم رہ جاتا ہے۔

حلیہ و عادات

رنگ گندمی مائل بہ زردی، چھریرا بدن، چمکیلی آنکھیں، سر پہ خاکستری رنگ کی دستار، بدن پہ جبہ، متین، نرم مزاج، غیبت و بدگوئی سے متنفر، ہر شخص سے محبت۔ درباروں سے گریزاں، عوام سے صحبت عابد و زاہد، شب بیدار، خاکسار و متواضع۔ اور ہر وقت اللہ کے تصور میں غرق۔

قدیم ترین سوانح

یوں تو آج تک مولانا کے حالات پہ اندازاً پچاس سے زائد مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن اس موضع پہ سب سے پہلے کتاب ولد نامہ ہے۔ جو مولانا کے فرزند سلطان ولد نے مثنوی کے بحر میں لکھی تھی۔ اور دوسری مناقب العارفین ہے جو مولانا کے ایک پوتے چلپی عارف کے ایک شاگرد افلاکی نے لکھی تھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ سر جیمز ریڈ ہاؤس (Sir James Red House) نے کیا تھا۔ باقی تمام سوانح بعد کے ہیں۔

معاصرین رومیؒ

گو رومی کا زمانہ عروج تاتار کا زمانہ تھا۔ اور تمام اسلامی سلطنتیں اس سیلاب میں بہہ نکلی تھیں۔ لیکن دنیائے اسلام میں چند بڑی بڑی ہستیاں موجود تھیں۔ مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۱۲۳۴ء) خواجہ فرید الدین عطار (م ۱۲۳۰ء) شیخ محی الدین ابن العربی (م ۱۲۴۰ء) محمد ضیاء الدین عبداللہ بن احمد المعروف بہ ان بیطار (م ۱۲۴۸ء) ابن حاجب (م ۱۲۴۸ء) ابن القفطی (۱۲۴۸ء) ابو یعقوب یوسف بن ابوبکر سکاکی (م ۱۲۲۹ء) احمد ابن تیمیہ (م ۱۳۲۷ء) ابن قدامہ (۱۲۸۳ء) ابن جوزی (م ۱۲۵۹ء) سعدی (م ۱۲۹۲ء) ابن خلکان (م ۱۲۸۲ء) یاقوتی (م ۱۲۲۹ء) ابن اثیر (م ۱۲۳۴ء) ابن ابی اُصیبعہ (م ۱۲۷۰ء) وغیرہ۔ یہ تمام بلند

پایہ فاضل اور چوٹی کے اہل قلم تھے۔

سعدیؒ و رومیؒ

سعدی کی وفات ۶۹۱ھ میں ہوئی اور رومی کی ۶۷۲ھ میں یہ دونوں بزرگ بہتر برس تک ہم زمانہ رہے۔ دونوں کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ سعدی کئی بار شام و روم میں گئے اور رومی بھی حلب و دمشق میں سات آٹھ سال تک رہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ سعدی کی تحریرات میں رومی کا ذکر نہیں ملتا۔ اور نہ رومی کے ہاں سعدی کا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ معاصرانہ رقابت ہو۔

البتہ مناقب[1] العارفین میں اتنا ضرور لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیراز کے ایک حاکم نے سعدی کو ایک صوفیانہ غزل کے لیے لکھا۔ سعدی نے رومی کی ایک غزل بھیج دی۔ اور ساتھ یہ لکھا کہ بلاد روم میں ایک خدا مست پیدا ہوا ہے۔ اور یہ غزل اسی کے سازِ حقیقت کا ایک نغمہ ہے۔

تصانیف رومی

تذکرہ نویسوں نے رومی کی صرف پانچ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

اول: مثنوی:۔ جس کے چھ دفتر (حصے) ہیں۔ اور اس کے اشعار کی تعداد اندازاً چھبیس ہزار ہے۔ اس میں کئی سو حکایات ہیں۔ جن کے مآخذ یہ ہیں۔ قرآن، حدیث، کلیلہ دمنہ۔ سنسکرت ایک کتاب پنجاتنترہ (عربی میں ترجمہ موجود ہے) ابن سینا۔ نظامی، سنائی، عطار، عوفی کی جوامع الحکایات اور عوامی کہانیاں۔

دوم: دیوان:۔ جس کے اشعار کی تعداد بدلتی رہتی ہے۔ لکھنؤ کے ۱۸۸۰ء والے ایڈیشن میں سات ہزار اشعار ہیں۔ رضا قلی خان پچاس ہزار بتاتا ہے۔ بعض ناقابل اعتماد نسخوں میں یہ تعداد صرف پانچ ہزار ہے۔ ایران کے ایک فاضل فروزاں فر نے ۱۹۳۶ء میں رومی کے سوانح لکھے تھے۔ اس کی رائے یہ ہے کہ دیوان میں کافی تحریف ہوئی ہے اور بعض لوگوں نے اس میں اپنی غزلیں داخل کر دی ہیں۔ اس دیوان کا قدیم ترین نسخہ[2]

---

[1] سوانح مولوی روم از شبلی ص ۲۲

[2] ملاحظہ پروفیسر آربری کی ''کلاسیکل پرشین لٹریچر'' طبع ۱۹۵۸ء ص ۲۳۰

ڈبلن کے ایک فاضل سر چیسٹر بیٹی (Sir Chester Beatty) کی ذاتی لائبریری میں ہے۔ جس میں اشعار کی تعداد چالیس ہزار ہے۔

سوم: مجالس سبعہ (تین حصے):۔ اس میں رومی کے وہ اقوال و مواعظ درج ہیں۔ جو آپ نے شمس کی ملاقات سے پہلے ارشاد فرمائے تھے۔

چہارم: خطوطِ رومی:۔ جو آپ نے احباب و اقارب کو لکھے تھے۔ ان کی تعداد ایک سو چوالیس ہے۔ انھیں محمد فریدوں فر نے ایڈٹ کر کے استنبول سے شائع کیا۔

پنجم: فیہ مافیہ:۔ یہ کتاب مولانا کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔ جنہیں آپ کے فرزند سلطان وَلَد نے جمع کیا تھا۔ بدیع الزماں فروزاں فر نے انھیں طہران سے شائع کیا ہے۔ بعد میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہے۔

پیغامِ رومیؒ

رومی سراپا عشق تھا۔ اور اس دولت کو دنیا میں تقسیم کرنے کے لیے وہ بے حد بے تاب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر عشق ہو تو انسان جمالِ کائنات ہے۔ ورنہ ننگ موجودات۔ عشق سب سے بڑی قوت، انسانی شخصیت کا سب سے بڑا سنگار اور شاہراہ زندگی پہ بلند ترین مینار روشنی ہے۔

جب ایک انسان گناہوں کو چھوڑ کر اللّٰہ کی طرف بڑھتا ہے تو سینے میں اک کسک سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ لگن، پھر تڑپ اور آخر میں مستی بن جاتی ہے۔ یہی مستی زندگی کی لذت ہے، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اللّٰہ کا تصور دل و دماغ پہ محیط رہتا ہے۔ اور قدم قدم پہ انسان سوچتا ہے۔ کہ اللّٰہ کو کونسی بات پسند ہے اور کونسی ناپسند۔ وہ ہر دکھ سکھ کو اللّٰہ کی طرف سے سمجھتا ہے۔ اور ہر حالت میں خوش رہتا ہے۔ وہ ماسوی اللّٰہ کو خاطر تک میں نہیں لاتا۔ اور اس بات پہ ایمان رکھتا ہے۔ کہ زندگی کی آخری منزل اللّٰہ ہے۔ اور یہ دنیا محض اک رہگزر ہے۔ جس کی لذتوں میں الجھ جانا گویا پستیوں میں بھٹکنا اور منزل کو کھو دینا ہے۔ رومی کے ہاں انسان ایک نورانی مسافر ہے۔ جو لامکانی بلندیوں سے اس خاکدان میں اترا اور قدم قدم پھر اسی منزل کو جا رہا ہے۔ کس قدر نادان ہے وہ مسافر جو کنار راہ کی آنی و عارضی بہاروں میں کھو جائے۔ اور راہ و منزل ہر دو کو بھول جائے۔

دما دم رواں ہے یم زندگی — ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
(اقبال)

میں اس حقیقت پہ محکم ایمان رکھتا ہوں کہ قوموں کے عروج و زوال میں عشق کا بڑا دخل ہے۔ جب تک عشق یا اس سے ملتی جلتی کوئی کیفیت موجود ہو تو زندگی قائم رہتی ہے۔ ورنہ مٹ جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ غیر مسلم اقوام کے عروج و زوال میں بعض دیگر عوامل کا بھی دخل ہو۔ لیکن مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ دراصل عشق کی تاریخ ہے۔ جب کبھی ان کے سینوں میں یہ مقدس آگ فروزاں ہوئی۔ وہ بحر و بر بلکہ دنیا کے قلب و نظر پہ چھا گئے۔ اور جونہی یہ آگ بجھی وہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔

رومی نے اپنے دور کو عشق کا پیغام دیا تھا۔ سات سو برس بعد اقبال نے اسی پیغام کو دہرایا۔

چو رومی در حرم دادم اذان من
از او آموختم اسرارِ جان من
بہ دور فتنۂ عصرِ کُہن او،
بہ دور فتنۂ عصر رواں من (اقبال)

رومی کی طرح میں نے حرم میں پھر اذان دی۔
میں نے عشق و روح کے اسرار رومی سے سیکھے ہیں۔
عصر قدیم کے پر آشوب ایام میں رومی آیا۔
اور عصر رواں کے فتنوں میں اقبال نے جنم لیا۔

اقبال کے بعد وہ آگ پھر بجھ رہی ہے۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ رومی کا پیغام اس سرزمین میں پھر عام کیا جائے۔ اور یہ کتاب اسی سلسلے میں ایک حقیری کوشش ہے۔

اے نغمہ سرا بیتے از مرشد روم آور
تا غوطہ زند جانم در آتش تبریزے (اقبال)

اے مطرب! مرشد رومی کی کوئی غزل گاؤ۔ تا کہ میری روح میں تبریز کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھے۔

رحلت

مولائے روم کی زندگی تین واضح حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے پچیس سال طلب علم میں گزارے۔ اگلے سترہ برس وعظ و تدریس میں بسر کیے اور آخری تیس سال وجد مستی میں کاٹے۔ آخر ۶۷۲ھ = ۱۲۷۴ء کی ایک شام کو رب العزت سے بلاوا آ گیا۔ اور آپ گاتے اور ناچتے ہوئے آستانِ یار پہ جا پہنچے۔

واہ رے شوق شہادت کوئے جاناں کی طرف
گنگناتا ، رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں (جگر مرادآبادی)

کیا رُومی واقعی وفات پا چکے ہیں؟ نہیں قطعاً نہیں۔ وہ خود جنت کی بہاروں میں مقیم ہیں اور ان کا پیغام چار دانگِ عالم میں گونج رہا ہے۔ نہ جانے کتنے ہی قافلوں کے لیے نوائے رومی صدائے جرس بنی اور وہ رواں دواں منزل پہ جا پہنچے۔

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیلؑ
یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لا الہٰ میں ہے
تلاش اس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہان تازہ تری آہ صبح گاہ میں ہے (اقبال)

رومی کے بعد حسام الدین (م ۶۸۳ھ = ۱۲۸۴ء) ان کے خلیفہ بنے اور پھر سلطان ولد (م

۷۱۰ھ = ۱۳۱۹ء) اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہ فرقہ جلالیہ یا مولویہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلے کے درویش نمدے کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ ذکر و عبادت کے وقت رقص کرتے ہیں۔ اور سماع کے وقت عموماً بانسری بجاتے ہیں اور کبھی کبھی دف بھی۔

یوم رومی

یوم رومی گزشتہ سات صدیوں سے تمام دنیائے اسلام میں منایا جا رہا ہے۔ لیکن جو اہتمام قونیہ میں کیا جاتا ہے۔ اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ میرے ایک دوست بریگیڈیر گلزار احمد[1] کوئی دو برس ہوئے ترکی میں گئے تھے۔ انھیں قونیہ میں یہ تقریب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ فرماتے ہیں کہ ایک بڑے ہال میں اس تقریب کا اہتمام تھا۔ داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ ہال میں اعیان و اکابر کثیر تعداد میں موجود تھے ایک طرف سٹیج بنا ہوا تھا۔ جس کے سامنے حسین پردے آویزاں تھے۔ وقت آنے پر یہ پردے اٹھے۔ اب نگاہوں کے سامنے ایک اور ہی عالم تھا۔ ایک بلند تخت پر "رومی" جلوہ فرما تھے۔ سامنے حسین لڑکیوں اور لڑکوں کی دو قطاریں تھیں۔ زرق برق لباس میں ملبوس۔ فرش پہ سبز و سرخ قالین اور اوپر رنگ برنگے قمقمے، خوشبو کی لپٹوں میں ساز چھڑا۔ بنسی کی دلدوز آواز بلند ہوئی۔ معاً وہ لڑکے اور لڑکیاں پریوں کی طرح تھرکنے، ناچنے اور گانے لگیں۔ ان کی لے اس قدر دل آویز اور مست تھی۔ کہ سامعین پہ وجد طاری ہو گیا۔ اور فضا جھوم اٹھی۔ رومی کی یہ غزل گائی جا رہی تھی۔

سار بانا! اشتراں بیں سر بسر قطار مست — مے مست و خواجہ مست و یار مست اغیار مست

باغبانا! رعد مطرب ابر ساقی آب مے — باغ مست و راغ مست و غنچہ مست و خار مست

آسمانا! چند گردی گردش عنصر بہ بیں — خاک مست و آب مست و باد مست و نار مست

باز بیں بر طور سینا جلوۂ حُسنِ ازل — ذرہ ذرہ درود عالم گشتہ موسیٰ دار مست

زاہد خلوت نشین و صوفی پرہیزگار
خرقہ ہا برتن دریدہ بر سر بازار مست

---

[1] تحصیل چکوال کی ایک بستی کٹاس کے رہنے والے کئی کتابوں کے مصنف اس وقت (۱۹۶۳ء) ان کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔

اے ساربان! اونٹوں کو دیکھو۔ ساری قطار مست ہے۔ میر کارواں، خواجہ، اپنے اور بیگانے سب مست ہیں۔

اے باغبان! کڑک گیت، بادل ساقی اور بارش شراب ہے۔ نتیجہ یہ کہ باغ، جنگل، پھول اور کانٹے سب مست ہیں۔

اے فلک! ذرا رک کر عناصر کا رقص دیکھو۔ خاک، ہوا، آب اور آتش سب مست ہیں۔

کوہِ طور پر اللہ نے پھر تجلیاں پھینکیں۔ اور دو عالم کا ہر ذرہ موسیٰؑ کی طرح مست ہے۔

گوشہ نشین زاہد! اور پارسا صوفی دلق پھاڑ کر برسر بازار مست ہیں۔

بارھواں باب

حکایاتِ رومیؒ

۱۴۱۔ آئینہ

ایک دن ابوجہل حضور صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا۔ کہ آپ کی صورت بہت قبیح ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم سچ کہتے ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت ابوبکرؓ حاضر ہوئے اور حضورؐ پرنور کے روئے مبارک کو دیکھ کر فرمانے لگے۔ آپ حسن میں آفتاب ہیں۔ حضورؐ نے کہا۔ تم بھی سچ کہتے ہو۔ حاضرین نے پوچھا کہ اے اللّٰہ کے مقدس رسولؐ، آپؐ نے ابوجہل اور حضرت صدیقؓ دونوں کو سچا کہہ دیا ہے۔ یہ کیا؟ فرمایا۔ میں ایک آئینہ ہوں۔ جس میں ان دونوں کو اپنی اپنی صورت نظر آئی تھی۔

۱۴۲۔ خر و پالان

ایک دہقان کے پاس گدھا تو تھا لیکن پالان نہ تھا۔ کافی دنوں کے بعد اس نے پالان بنایا۔ لیکن گدھے کو بھیڑیا کھا گیا۔

تقدیر عموماً انسانی تدبیر کا مذاق اڑاتی ہے۔

۱۴۳۔ شکار

ایک شیر شکار کے لیے نکلا۔ اس کے ہمراہ ایک لومڑی اور ایک بھیڑیا بھی تھا۔ انھوں نے تین چیزیں ماریں، نیل گائے، ہرن اور خرگوش۔ شیر نے بھیڑیے سے کہا۔ کہ شکار کو تقسیم کرو۔ اس نے کہا۔ نیل گائے آپ کی۔ ہرن میرا اور خرگوش لومڑی کا۔ شیر نے اس کے منہ پہ اس زور سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ کہ وہ فوراً ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد لومڑی سے کہا۔ کہ آگے آؤ اور شکار کو تقسیم کرو۔ اس نے کہا۔ اے شاہ جنگل! آپ خرگوش سے ناشتہ فرمائیں۔ ہرن دن کو کھائیں اور گائے رات کو۔ شیر نے پوچھا یہ منصفانہ تقسیم تم نے کس سے سیکھی۔ کہا۔ اس بھیڑیے سے۔

جو لوگ دوسروں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ وہ خود دوسروں کے لیے عبرت بن جاتے ہیں۔

۱۴۴۔ مقابلۂ نقاشی

ایک مرتبہ چینیوں اور رومیوں میں نقاشی کا مقابلہ ہو گیا۔ ایک بڑے کمرے کا نصف رومیوں نے لے لیا اور نصف دیگر چینیوں نے۔ بیچ میں پردہ تان دیا گیا۔ چینیوں نے مختلف رنگوں کی آمیزش سے بہت دل آویز نقش و نگار بنائے۔ اور رومی اپنے حصے کو صرف صیقل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ دیواریں شیشہ بن گئیں۔ مقابلے کے دن جب وہ پردہ ہٹا تو چینیوں کے تمام نقش و نگار رومیوں کے حصے میں منعکس ہو گئے۔ اور وہ جیت گئے۔

عالم لاہوت (خدائی) کے نقش و نگار اسی سینے میں منعکس ہوتے ہیں۔ جو گناہوں سے صاف ہو۔

۱۴۵۔ علیؓ اور کافر

ایک جنگ میں حضرت علیؓ نے ایک کافر کو نیچے گرا لیا۔ اور تلوار سے اس کا کام تمام کرنے کو تھے کہ اس نے آپ کے روئے مبارک پہ تھوک دیا۔ اس پر شیرِ خدا نے تلوار پھینک دی۔ اور کافر کو چھوڑ دیا۔ کافر نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میرا جہاد اللہ کے لیے تھا نہ کہ اپنے لیے۔ تو نے میرے منہ پر تھوک کر مجھے غصہ دلایا ہے۔ اور میرے بے لوث ارادوں میں ذاتی انتقام کی آمیزش کر دی ہے۔ چونکہ میری تلوار اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اور میں اسے ذاتی انتقام کے لیے استعمال نہیں کیا کرتا۔ اس لیے تمہیں معاف کرتا ہوں۔ شیرِ خدا کا یہ اخلاق دیکھ کر وہ کافر مسلمان ہو گیا۔

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

حلم و اخلاق کی تلوار فولادی تلوار سے زیادہ تیز بلکہ سو لشکروں سے زیادہ ظفر انگیز (ملک گیر) ہوتی ہے۔

۱۴۶۔ پردۂ مُو

فاروق اعظمؓ کا زمانہ تھا۔ اور سارا مدینہ رمضان کا چاند دیکھ رہا تھا۔ ایک شخص چلاّ اٹھا کہ وہ ہے چاند۔ جب باقی لوگ چاند کو دیکھنے میں ناکام رہے۔ اور اس شخص کا شور بڑھتا ہی گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ پانی میں ہاتھ بھگو کر آنکھوں اور بھوؤں کو صاف کرو اور پھر دیکھو۔ جب اس نے حکم کی تعمیل کی۔ تو وہ چاند غائب ہو گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے بھوؤں کا ایک بال کج ہو کر آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ اور چاند نظر آتا تھا۔

موئے کژ چوں پردۂ گردوں شود
چوں ہمہ اجزات کژ شد چوں بود

اگر ایک ٹیڑھا بال آسمانوں کا حجاب بن سکتا ہے۔ تو سوچو کہ اگر تمہارے حواس کج ہو جائیں۔ تو کیا ہو گا۔

۱۴۷۔ سانپ کی چوری

ایک آدمی کو سانپ پالنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن اس نے ایک سانپ پکڑا۔ لیکن رات کو کوئی چور اٹھا لے گیا۔ وہ آدمی کھوج لگانے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو قریب ہی چور کی لاش دیکھی۔ جو سانپ کے ڈسنے سے مر چکا تھا۔

دنیا میں کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں۔ جن پہ ہم جان دیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ ہمارے لیے سانپ ہیں۔

۱۴۸۔ باز کی حجامت

ایک دفعہ ایک باز شاہی محل سے اڑ کر ایک بوڑھے کی کٹیا میں چلا گیا۔ بوڑھے نے اسے پکڑ لیا۔ دیکھا بھالا۔ پیار کیا۔ اور پھر کہنے لگا۔ اے حسین پرندے! نہ جانے تو کس ناقدر شناس کے پاس رہا ہے۔ کہ تیرے ناخن بڑھ گئے۔ بال لمبے ہو گئے۔ اور اس نے پرواہ تک نہ کی۔ اس کے بعد اس نے قینچی لی اور اس کی چونچ، پَر اور ناخن سب کاٹ ڈالے۔

ہر کہ با جاہل بود ہمراز باز
آں رسد با اُو کہ با آں شاہباز

جو شخص کسی جاہل سے دوستی ڈالے گا۔ اس کا حال وہی ہوگا۔ جو باز کا ہوا۔

۱۴۹۔ مُردے کا زندہ ہونا

حضرت مسیح علیہ السلام کہیں جا رہے تھے۔ ایک شخص ان کے ساتھ تھا۔ وہ بار بار کہتا کہ اے حضرت! آج کسی مردے کو زندہ کیجئے۔ حضرت مسیحؑ اسے اس خواہش سے روکتے۔ لیکن وہ باز نہ آتا۔ اسی اثنا میں اس نے ہڈیوں کا ایک پنجر دیکھ لیا۔ جو راہ کے قریب پڑا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ حضرت کا دامن پکڑ لیا۔ اور لگا ضد کرنے کہ اسے زندہ کیجئے۔ عیسیٰ علیہ السلام مجبور ہو گئے۔ اور انہوں نے ہڈیوں کو حکم دیا۔ قم باذن اللّٰہ کہ اللہ کے حکم کے زندہ ہو جاؤ۔ فوراً ایک دھاڑتا ہوا شیر اٹھا۔ اس شخص پہ جھپٹا۔ اور چیر پھاڑ کر کھا گیا۔

انسان کی کتنی ہی ایسی خواہشات ہیں۔ جن کا تکمیل تک نہ پہنچنا رحمت اور پورا ہونا ہلاکت ہے۔

۱۵۰۔ گاو روستائی

ایک دیہاتی کے پاس ایک خوبصورت سی گائے تھی۔ جس سے وہ بڑا پیار کرتا تھا اگر رات کو کبھی آنکھ کھل جاتی۔ تو اٹھ کر گائے کے پاس جاتا۔ اس کے جسم پہ ہاتھ پھیرتا تھپکاتا۔ اور دوبارہ لیٹ جاتا۔ ایک رات ایک شیر وہاں آنکلا۔ دیکھا کہ گائے بندھی ہے۔ چپکے سے کھا گیا۔ اور اس کی جگہ خود بیٹھ گیا۔ حسب معمول آدھی رات کے وقت دیہاتی کی آنکھ کھلی۔ وہ اٹھا۔ گائے کی طرف گیا۔ اور شیر کو گائے سمجھ کر اس کے جسم پہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ چونکہ شیر کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ اس نے دیہاتی کو کچھ نہ کہا۔ اور دل میں سوچتا رہا۔ کہ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں شیر ہوں۔ تو اس کا کلیجہ ابھی پھٹ جائے اور دل خون ہو جائے۔

انسان کا نفس ایک ہولناک شیر ہے۔ جسے ہم اندھے پن کی وجہ سے گائے سمجھ کر پالتے رہتے ہیں۔

۱۵۱۔ پیاسا اور دیوار

ایک پیاسا ایک ایسے چشمہ پہ پہنچا۔ جس کے اردگرد ایک دیوار تھی اور پانی تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مایوس ہوکر وہ دیوار پہ بیٹھ گیا۔ اور دل بہلانے کے لیے دیوار کے پتھر پانی میں پھینکنے لگا۔ کچھ وقفے کے بعد پانی کی سطح بلند ہوگئی، دیوار پست ہوگئی اور پیاسا پانی تک پہنچ گیا۔

خدا اور تمہارے درمیان پست خواہشات کی دیوار حائل ہے۔ اسے گرادو اور جھک کر بلند ہو جاؤ۔

وَاسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ

سجدے میں گرو اور اللہ کا قرب پالو۔

۱۵۲۔ خاردار درخت

ایک آدمی نے راستے پہ ایک خاردار درخت لگایا۔ لوگوں نے اسے ہزار روکا۔ لیکن اس نے پرواہ نہ کی۔ وہ درخت بڑھنے لگا۔ اور اس کے کانٹے لوگوں کے پاؤں میں چبھنے لگے۔ جب بات حاکم تک پہنچی۔ تو اس نے اسے بلا کر سمجھایا۔ اور درخت کو کاٹنے کی ہدایت کی۔ وہ آج کل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ درخت جوان ہوگیا۔ اور وہ شخص بوڑھا۔ اس منزل پہ اس نے درخت کو نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن بیسود۔ کیونکہ جسمانی طاقت ختم ہوچکی تھی۔

انسان کی عادات بد خاردار درخت ہیں۔ اگر شروع ہی میں ان کا استیصال نہ کیا جائے۔ تو یہ بلائے جان بن جاتی ہیں۔

خار بن دان ہر یکے خوئے بدت
بارہا در پائے خار آخر زدت

تمہاری ہر بری عادت ایک خاردار جھاڑی ہے۔ جس کے کانٹے تمہیں بار بار چبھیں گے۔

او جواں تر می شود تو پیر تر
زود باش و روزگار خود مبر ،

یہ درخت جوان ہو رہا ہے۔ اور تم بوڑھے۔ جلد اس کی بیخ نکالو اور وقت ضائع نہ کرو۔

۱۵۳۔ آقا و غلام

ایک بادشاہ نے لقمان کو کہا۔ کہ مجھ سے کچھ مانگو۔ لقمان نے کہا کہ تم اپنی حیثیت کو پہچانو تم حرص وغضب کے غلام ہو اور یہ دونوں میرے غلام ہیں۔ میرے غلاموں کا غلام بھلا مجھے کیا دے سکتا ہے۔

خواجۂ لقمان بہ ظاہر خواجہ وش
درحقیقت بندہ ، لقمان خواجہ اش

بظاہر تو لقمان کا آقا، آقا نظر آتا تھا۔ لیکن دراصل وہ غلام تھا۔ اور لقمان آقا۔

۱۵۴۔ فلسفی

ایک پارسا مسجد میں بلند آواز سے تلاوت کر رہا تھا۔ جب وہ اس آیت پہ پہنچا:۔

قُلْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝

(اے رسولؐ! ان سے پوچھو۔ کہ اگر تمہارے چشمے سوکھ جائیں۔ تو پانی کو دوبارہ کون لائے گا)

تو اتفاقاً ایک فلسفی پاس سے گزر رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ہم زمین کو کدال سے کھود کر پانی نکال لائیں گے۔

دوسری صبح جب وہ نیند سے جاگا۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ نظر غائب ہے۔ اس نے شور مچایا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں وہ قاری بھی تھا۔ فلسفی کہنے لگا۔ ہائے لوگو! اب میری نظر کیسے واپس آئے گی۔ قاری نے کہا۔ مشکل کیا ہے؟ کدال لو اور آنکھوں کو کھود کر نورِ نظر نکال لاؤ۔

۱۵۵۔ شبان و موسیٰؑ

ایک گڈریا صحرا میں بکریاں چرا رہا تھا۔ نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اللہ کو مخاطب کر کے کہنے

لگا۔اے اللہ!اگر تو مجھے مل جائے۔تو میں تمہاری ہر طرح سے خدمت کروں۔تیرے کپڑے سیؤں ،بالوں کو کنگھا کروں۔تجھے بکریوں کا دودھ پلاؤں۔تیرے ہاتھ چوموں۔پاؤں ملوں۔تجھے پنیر اور پراٹھے کھلاؤں۔اور میٹھے دہی کی لسی پلاؤں۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کہیں قریب تھے وہ سب باتیں سن رہے تھے۔فرمانے لگے۔اے او جاہل گڈریے!تو یہ کیا بک رہا ہے۔اللہ کے حضور میں یہ گستاخی!ممکن ہے کہ آسمانوں سے آگ اترے اور تجھے بھسم کر ڈالے۔بھاگ یہاں سے۔فوراً توبہ کر اور اللہ سے معافی مانگ۔ورنہ تیری خیر نہیں۔

گڈریے نے جب پیغمبر کی زبان سے یہ بات سنی۔تو ڈر سے لرزنے لگا۔اس کے بعد ایک چیخ ماری اور وہاں سے بھاگ گیا۔فوراً وحی آئی۔اور موسیٰ سے کہا: کہ اے موسیٰ!تم نے یہ کیا کیا۔ کہ ہمارا بندہ ہم سے جدا کر دیا۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

تمہارا کام بندوں کو ہم سے ملانا تھا۔نہ کہ بھگانا۔

ما بروں را ننگریم و قال را
ما دروں را بنگریم و حال را

ہم ظاہر کو نہیں دیکھتے۔نہ زبانی باتوں کو وقعت دیتے ہیں۔ہمارا معاملہ دل اور واردات دل سے ہے۔

۱۵۶۔سوار اور مار

ایک سوار نے ایک درخت کے نیچے ایک سویا ہوا آدمی دیکھا۔جس کے منہ میں سانپ داخل ہو رہا تھا۔اس نے اسے جگایا۔دو چار ڈنڈے لگائے اور گھوڑے کے آگے ڈال لیا۔اس نے ہزار شور مچایا۔کہ ظالم میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔اور مجھے کیوں پیٹ رہے ہو۔لیکن سوار نے سنی ان سنی کر دی۔اور سیدھا سیب کے ایک درخت کے پاس جا رکا۔وہاں پہنچ کر اس نے اسے زبردستی کئی

درجن سیب کھلا دیے کہتے ہیں کہ سیب علاج زہر ہے۔اور سانپ بھی اس سے دور بھاگتا ہے۔
چنانچہ وہ سانپ اس کے پیٹ سے نکل آیا۔اس شخص کو اب معلوم ہوا کہ وہ مار اس کے لیے کتنی بڑی رحمت تھی۔

شیطان ایک سانپ ہے۔جو انسان کے اندر داخل ہو چکا ہے۔رسولؐ وہ سوار ہے۔اور ہم وہ احمق جو رسولؐ سے گریزاں ہیں۔

خر گریزد از خداوند از خری
صاحبش درپے زنیکو اختری

گدھا اپنے مالک سے گدھے پن کی وجہ سے بھاگتا ہے۔اور مالک محبت
کی وجہ سے اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے۔

۱۵۷۔جالینوس و دیوانہ

ایک دن جالینوس نے خادم سے کہا۔کہ مجھے فلاں دوا پلاؤ۔اس نے کہا۔میرے آقا وہ تو دیوانگی کی دوا ہے۔کہا اسی لیے تو مانگ رہا ہوں۔آج صبح ایک دیوانہ یہاں سے گزرا۔مجھے دیکھ کر رک گیا۔مسکرایا اور اشارے کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔اگر میں اس کا ہم جنس و ہم مشرب نہ ہوتا۔تو وہ مجھے اس محبت سے نہ دیکھتا۔

انسان ہم پایۂ ملائک ہے۔لیکن گرتے گرتے اس سطح پہ آجاتا ہے۔کہ شیطان اسے دیکھ کر مسکراتے اور اشارے کرتے ہیں۔

۱۵۸۔ریچھ کی دوستی

ایک شخص نے ریچھ پال رکھا تھا۔کئی بار اسے دوستوں نے سمجھایا کہ اس جاہل اور وحشی درندے کو گھر سے نکالو۔لیکن وہ نہ سنتا۔اور کہتا کہ یہ بڑا عقل مند ریچھ ہے۔یہ میری چوکیداری کرتا۔اور میری خاطر شیر و پلنگ سے الجھ پڑتا ہے۔ایک روز وہ سو رہا تھا۔اور ریچھ پاس بیٹھ کر پنکھا ہلا رہا تھا۔ایک مکھی بار بار اس کے منہ پہ آبیٹھتی اور ریچھ بار بار اسے اڑاتا۔جب وہ مکھی باز نہ

آئی۔ تو ریچھ اٹھا۔ ایک وزنی سل کہیں سے لے آیا۔ اور مکھی کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی وہ آئی۔ اس نے پوری قوت سے وہ سل آقا کے منہ پر دے ماری۔ اور اس کا بھیجا نکال دیا۔

مہر ابلہ مہر خرس آمد یقیں

کین او مہراست و مہراوست کیں

بیوقوف سے دوستی گویا ریچھ سے دوستی ہے۔ اس کی محبت عداوت اور عداوت محبت۔

۱۵۹۔ خدا کی عیادت

ایک دفعہ اللہ نے وحی کی وساطت سے موسیٰؑ سے پوچھا۔ کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ تم میری عیادت کو کیوں نہیں آئے۔ موسیٰ نے حیرت سے پوچھا۔ اے رب! تیری مقدس ذات تو تمام امراض و عیوب سے پاک ہے۔ میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ جواب آیا۔ کہ فلاں مقام پر میرا ایک برگزیدہ بندہ رہتا ہے۔ وہ چند روز سے بیمار ہے۔ اور اس کا دکھ میرا دکھ ہے۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا

او نشیند در حضور اولیا

جو شخص اللہ کی صحبت چاہتا ہے وہ اولیا کے حضور میں بیٹھتا ہے۔

چوں شوی دور از حضور اولیا

در حقیقت گشتۂ دور از خدا

اولیا سے دوری درحقیقت اللہ سے دوری ہے۔

۱۶۰۔ ہمارے گھر

ایک بچہ باپ کی میت پہ زار زار رو رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ پیارے ابا! یہ لوگ تمہیں ایک ایسے تنگ و تاریک گھر میں لیے جا رہے ہیں۔ جہاں نہ چارپائی ہے نہ بستر نہ دیا۔ نہ کھانا نہ پانی اور نہ کوئی یار و خویش۔ ایک لڑکا اپنے باپ سے پوچھنے لگا۔ کیوں ابا۔ کیا یہ جنازہ ہمارے گھر جا رہا

ہے۔ یہ تمام خوبیاں تو صرف ہمارے گھر میں پائی جاتی ہیں۔

جو دل کہ خدائی سورج کی شعاعوں سے محروم ہو جائے۔ وہ قبر سے زیادہ تنگ و تاریک ہو جاتا ہے۔

۱۶۱۔ انگور

ایک مرتبہ چار مسافروں کو جن میں سے ایک ایرانی، دوسرا ترک، تیسرا رومی اور چوتھا عرب تھا۔ کسی نے ایک درہم دے دیا۔ اب یہ چاروں باہم الجھ پڑے۔ ایرانی کہتا میں انگور کھاؤں گا۔ ترک اوزم (انگور) مانگتا۔ عرب عنب (انگور) چاہتا اور رومی استافیل (انگور) کا تقاضہ کرتا۔ ان کا جھگڑا اس حد تک بڑھا کہ انھوں نے ایک دوسرے کے گریبان اور سر پھاڑ ڈالے۔ اتفاقاً وہاں سے ایک عالم گزرا جو بہت سی زبانیں جانتا تھا۔ اس نے ان سے وہ درہم لے لیا۔ بازار سے انگور خریدا اور لا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ سارے خوشی سے اچھل پڑے۔ آپس میں گلے مل گئے اور اس عالم کو دعائیں دینے لگے۔

دنیائے انسانی زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے باہم الجھی ہوئی تھی۔ کہ عرب میں ایک دانشور پیدا ہوا۔ جس نے حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ اور دنیا کو بتایا کہ ایک خدا کا پیغام ایک نسل انسانی کی طرف ہر زمانے میں ایک تھا۔ اس لیے یہ اختلافات بے اساس ہیں۔ دنیا اس بات کو آہستہ آہستہ سمجھ رہی ہے اور ایک زمانہ آئے گا کہ تمام انسان ایک ہو کر گلے مل جائیں گے۔

۱۶۲۔ اژدہا

ایک سپیرا سانپ پکڑنے کے لیے جنگل میں گیا۔ وہاں برف میں ایک ٹھٹھرا ہوا اژدہا پڑا تھا۔ اس نے سمجھا کہ مر چکا ہے۔ اسے اٹھا کر بغداد میں لے آیا۔ بازار میں اسے نمائش کے لیے رکھا۔ اور لگا ڈینگیں مارنے۔ کہ سانپ نے یوں مقابلہ کیا تھا۔ میں نے فلاں منتر پڑھا۔ اور بالآخر اسے یوں قابو کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کی تقریر جاری تھی کہ سورج کی گرم شعاعوں سے اژدہا کو ہوش آ گیا۔ وہ بل کھا کر اٹھا اور سپیرے کو ہڑپ کر گیا۔

نفس ایک اژدہا ہے۔ جو اللہ کے ذکر و فقر سے ٹھٹھر جاتا ہے۔ اور خواہشات کی حرارت سے پھر حرکت میں آ جاتا ہے۔

۱۶۳۔ تسلیم و رضا

بہلول نے ایک صاحب دل سے اس کا مزاج پوچھا۔ کہا بہت خوش ہوں کیونکہ دنیا میں ہر بات میری خواہش کے مطابق ہو رہی ہے۔ پوچھا۔ وہ کیسے؟ آخر کوئی نہ کوئی بات تو تمہاری مرضی کے خلاف ہوتی ہو گی۔ کہا ہرگز نہیں۔ کیونکہ اللہ کی قضا میری رضا ہے۔ اور میں اس کے ہر فعل پہ مسرور و مطمئن رہتا ہوں۔

۱۶۴۔ مار و موزہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو سے فارغ ہونے کے بعد جوتا پہننے لگے تو ایک چیل جھپٹی اور جوتا اٹھا کر ہوا میں لے گئی۔ اس نے جوتے کو الٹایا اور اس سے ایک سانپ نکل کر نیچے گر پڑا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ زمین کی طرف آئی اور جوتا حضورؐ کے قریب رکھ کر چلی گئی۔

جب ایک انسان اللہ کے سامنے جھک جاتا ہے تو خدا اور اس کی تمام کائنات اس کی حفاظت و مدد کرتی ہے۔ دکھ پہ غم نہ کھاؤ۔ ممکن ہے کہ یہ سکھ کی تمہید ہو یا اس کا مقصد تمہیں کسی بڑے دکھ سے بچانا ہو۔

ہرچہ از تو یاوہ گردد از قضا
تو یقیں داں کہ خریدت از بلا،

اگر اتفاقاً تمہاری کوئی چیز (موزۂ حضور کی طرح) گم ہو جائے تو یقین کرو۔ کہ کوئی بہت بڑی مصیبت ٹل گئی ہے۔

۱۶۵۔ زبانِ حیوانات

ایک شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بار بار کہتا۔ کہ مجھے جانوروں کی بولی سکھایئے جب

اس کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو حضرت نے اسے کتے اور مرغ کی بولی سکھلا دی۔ اتفاق یہ کہ یہ دونوں جانور اس کے گھر میں موجود تھے۔ وہ کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا مرغ کتے سے کہہ رہا تھا۔ مبارک ہو کہ کل خواجہ صاحب کا گھوڑا مرے گا۔ اور تمہارے مزے ہو جائیں گے۔ جونہی اس نے یہ بات سنی۔ گھوڑے کو منڈی میں لے گیا اور فروخت کر دیا۔ اس پر کتا اداس سا ہو گیا۔ مرغ نے کہا۔ کہ فکر نہ کرو۔ پرسوں اس کا اونٹ مرے گا۔ اور اترسوں اس کا غلام۔ غلام کے مرنے پہ بہت بڑی دعوت ہو گی۔ اور تمہیں بے شمار ہڈیاں ملیں گی۔ خواجہ صاحب نے فوراً اونٹ اور غلام کو بھی بیچ ڈالا۔ دو چار دن بعد جب کتے نے پھر بھوک اور بدبختی کا رونا رویا۔ تو مرغ نے کہا کہ کل خواجہ صاحب کی اپنی وفات ہو گی۔ دعوتوں کا سلسلہ چالیس دن تک جاری رہے گا اور تمہارے تمام گلے دھل جائیں گے۔

یہ سنتے ہی اس شخص کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بھاگتا ہوا حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں پہنچا۔ اور دعائے زندگی کا طالب ہوا۔ آپؑ نے فرمایا۔ کہ موت برحق ہے۔ اور ہر شخص نے آخر مرنا ہے۔ اگر تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ سنو:۔

چوں کہ ایمان بردہ باشی زندہٗ
چوں کہ با ایماں روی پائندہٗ

اگر تم اس دنیا سے ایمان ساتھ لے گئے تو زندہ رہو گے۔ ورنہ مر جاؤ گے۔

۱۶۶۔ بے زرہ

حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ سے کسی نے پوچھا۔ کہ آپ پہلے جنگ میں زرہ پہن کر آتے تھے۔ اور آج کل بے زرہ آجاتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اسلام لانے سے پہلے میں موت کو خاتمۂ حیات سمجھتا تھا۔ اس لیے جان کی حفاظت کرتا تھا۔ اور اب رسول کریمؐ کی فیض سے اسے درِ جنت سمجھتا ہوں۔ اس لیے زرہ ترک کر دی ہے۔ تا کہ میرے اور جنت کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ رہے۔

مرگ ہر یک اے پسر ہمرنگ اوست
آئینہ صافی یقیں ہمرنگ روست

موت کی دنیا مرنے والے کے کردار کے مطابق ہوتی ہے۔ موت ایسا آئینہ ہے جس میں مرنے والا اپنی تصویر دیکھتا ہے۔

۱۶۷۔ سوال وجواب

حضرت مسیح علیہ السلام سے کسی نے پوچھا۔ کہ دنیا میں سب سے زیادہ خوفناک چیز کون سی ہے؟ فرمایا۔ اللہ کا غصہ۔ پوچھا اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ کہا غصہ پی جانا اور قصور وار کو معاف کر دینا۔

۱۶۸۔ علیؓ ویہودی

ایک یہودی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا۔ کہ کیا آپ خدا کو اپنا حافظ سمجھتے ہیں۔ فرمایا بے شک۔ کہنے لگا تو پھر اس اونچے مکان کی چھت سے کود کر دکھایئے تا کہ خدا کے حافظ ہونے کا امتحان ہو جائے۔ کہا کہ بندے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کا امتحان لے۔ یہ تو ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی خرگوش شیر کا اور کنکر پہاڑ کا امتحان لینے لگے۔

۱۶۹۔ درویش ہیزم کش

میں نے ایک درویش کو دیکھا۔ کہ سر پہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ مجھے اس پر بہت رحم آیا۔ میری جیب میں چند درم تھے۔ سوچا کہ اسے دے دوں تا کہ اس کے دو چار دن تو آرام سے کٹ جائیں۔ میرے اس ارادے ہی سے درویش کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ وہ میری طرف بڑھا۔ اور غصے سے وہ گٹھا میرے سامنے دے مارا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تمام لکڑیاں سونا بن گئی ہیں۔ میری طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا۔ میرا رازق تو نہیں خدا ہے۔ اس کے بعد وہ گٹھا اٹھا کر چلا گیا۔

۱۷۰۔ دستار فقیہہ

پرانے زمانے میں بڑی پگڑی بڑے علم کی علامت تھی۔ اسی زمانے کا قصہ ہے۔ کہ ایک

عالم سر پہ بہت بڑا پگڑ باندھتا تھا۔ اور ایک چور اس کی تاڑ میں رہتا تھا۔ ایک دن مولوی صاحب مکتب کی طرف جا رہے تھے۔ کہ چور جھپٹا اور دستار لے کر بھاگ گیا۔ جب آگے جا کر اسے کھولا۔ تو کیا دیکھتا ہے کہ دو گز لمبے ریشمی رومال میں غلیظ چیتھڑے اور بوری کے ٹکڑے لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ سب کچھ وہیں پھینک کر غائب ہو گیا۔

یہ دنیا باہر سے حسین ہے۔ اور اس کا باطن دستارِ مولوی کی طرح غلیظ ہے۔

۱۷۱۔ ہم جنس

ایک عورت حضرت علیؓ کے پاس فریاد لے کر آئی کہ یا حضرت میرا بچہ ایک کھڈ کے دہانے پہ بیٹھا ہوا ہے۔ اگر میں اس کی طرف جاتی ہوں۔ تو وہ آگے کو سرک جاتا ہے اور کسی طرح واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ فرمایا تم اسی عمر کا ایک بچہ اسے دور سے دکھاؤ۔ ہم جنس کو دیکھ کر واپس آ جائے گا۔ عورت نے ایسا ہی کیا۔ اور بچہ کھڈ کے دہانے سے لوٹ آیا۔

جنس کی کشش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء جنس بشر سے آئے ہیں۔ تا کہ جنس جنس کو کھینچ سکے۔

۱۷۲۔ بہشت و دوزخ

ایک آدمی نے ایک صاحب دل سے پوچھا۔ کہ بہشت و دوزخ کی تعریف کیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے کرم کا نام بہشت ہے۔ اور غضب کا جہنم۔ تشنہ و مردہ زمین پہ بادل برسے تو وہ چمن بن جاتی ہے۔ اور چمن بارش سے محروم ہو جائے۔ تو وہ اجڑ جاتا ہے۔ پر سکون نیند جنت ہے۔ اور نیند کو اڑا دینے والی بے چینی جہنم۔ قناعت جنت ہے اور حرص جہنم۔

هر کجا خواهد خدا دوزخ کند
اوج را برمرغ دام و فخ کند

اللہ جہاں چاہے دوزخ بنا سکتا ہے۔ وہ فضاؤں میں پرندوں کے لیے
جال بچھا سکتا ہے۔

۱۷۳۔ سوالِ موسیٰؑ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے پوچھا۔ کہ اے رب! کیا وجہ ہے کہ تو پہلے چیزوں کو بناتا اور پھر توڑ دیتا ہے۔ انسانوں کو پیدا کرتا اور پھر انھیں حوالۂ موت کر دیتا ہے۔ جواب ملا کہ اے موسیٰ! تمہارے سوال کا جواب بعد میں دوں گا۔ تم زمین میں ہل چلاؤ اور دانہ ڈالو۔ موسیٰ علیہ السلام نے تعمیل کی۔ جب فصل پک کر تیار ہو گئی۔ اور موسیٰ علیہ السلام درانتی لے کر کاٹنے لگے۔ تو ندا آئی۔ یہ ہے تمہارے سوال کا جواب۔

روح ایک بیج ہے جو جسم کو کھیت میں بویا جاتا ہے۔ محنتی کسان کی فصل اچھی ہوتی ہے اور کاہل کی خراب۔ وقت آنے پہ دونوں فصل کو کاٹتے ہیں۔ موت کشتِ زندگی کے لیے درانتی ہے۔

۱۷۴۔ ماشکی کا گدھا

ایک ماشکی کا گدھا شاہی اصطبل میں جا نکلا۔ جب وہاں نہایت تروتازہ، فربہ اور چست گھوڑے دیکھے۔ تو کہنے لگا۔ اے اللہ! تو نے مجھے کس عذاب میں رکھا ہوا ہے۔ میرا آقا صبح سے شام تک مجھے لادتا، ہر روز سر و پشت پہ سینکڑوں ڈنڈے برساتا ہے اور کھانے کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ دوسری طرف ان گھوڑوں کا یہ حال کہ کھانے کو ہری گھاس اور دانہ، رہائش کے لیے صاف اور کھلے تھان۔ اور خدمت کے لیے کئی نوکر۔ گدھے کی فریاد جاری تھی کہ نقارۂ جنگ پہ چوب پڑی۔ تمام گھوڑے میدانِ حرب میں پہنچ گئے۔ اور جب شام کو واپس آئے تو کسی کی دم غائب تھی اور کسی کے کان جسم میں درجنوں تیر پیوست تھے۔ اور زخموں سے لہو کی ندیاں رواں تھیں۔ یہ حال دیکھ کر:۔

چو خر آن را دید، پس گفت اے خدا
من بفقر و عافیت دادم رضا

گدھا کہنے لگا۔ اے رب! میری گستاخی معاف (مجھے اپنی یہ غریبی منظور ہے)

قدرِ عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید (سعدی)

آرام کی قدر وہی کر سکتا ہے۔ جو مصیبت میں پھنس جائے۔

۱۷۵۔ غم فردا

ایک جزیرے میں ایک سرسبز کھیت تھا۔ جس میں ایک گائے رہتی تھی۔ وہ صبح چرنے کو نکلتی اور رات تک سارا کھیت ختم کر دیتی۔ شام کے وقت وہ خوب تومند اور فربہ نظر آتی۔ لیکن رات کو اس فکر میں گھلنا شروع کر دیتی۔ کہ ہائے کل کیا کھاؤں گی اور صبح تک سوکھ کر کانٹا بن جاتی۔ اللہ کی شان کہ ہر صبح کو وہ کھیت پھر ہرا بھرا ہو جاتا۔ وہ گائے ہر شام کو موٹی اور ہر صبح کو پتلی ہو جاتی۔ یہ کیفیت موت تک جاری رہی۔ اور گائے کو زندگی کی آخری شب تک اللہ کی رزاقی پہ اعتبار نہ آیا۔

یہی حال انسان کا ہے کہ ہر روز چار وقت کھاتا ہے اور رات کو اس فکر میں ڈوب جاتا ہے کہ کل کیا کھاؤں گا۔ میری اولاد کا کیا بنے گا۔ اور میری وفات کے بعد پسماندگان پہ کیا بیتے گی؟

سالہا خوردی و کم نامد زخور
ترک مستقبل کن و ماضی نگر

تم سالہا سال سے کھا رہے ہو اور تمہاری روزی ختم نہیں ہوئی۔ پس تم اپنے ماضی سے سبق لو۔ اور غم فردا چھوڑ دو۔

۱۷۶۔ تلاش آدم

ایک آدمی دن کے وقت چراغ ہاتھ میں لیے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ کیا تلاش کر رہے ہو۔ کہا آدمی۔ پوچھا۔ کیا یہ ہزاروں انسان جو کوچہ و بازار میں گھوم رہے ہیں آدمی نہیں ہیں؟ کہا نہیں۔ آدمی وہ ہے۔ جو خواہش اور غصے کا غلام نہ ہو۔ اور دنیا میں ایسے لوگ کہاں؟

۱۷۷۔ گستاخ درویش

ایک درویش ہرات کے بازار سے گزر رہا تھا۔ اس کی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی۔ جس کا لباس اطلس کا تھا۔ کمر بند سونے کا اور ساتھ دو چار خدمت گار بھی تھے۔ پوچھا یہ کون ہے؟ جواب ملا شہر کے فلاں رئیس کا بندہ (غلام) ہے۔ فوراً منہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہنے لگا۔

بندہ پروردن بیاموز اے خدا
از رئیس و اختیار شہر ما

اے خدا بندے پالنا اس رئیس سے سیکھ۔

چندروز بعد بادشاہ کسی بات پر اس رئیس سے بگڑ گیا۔اسے جیل میں ڈال دیا۔اوراس کے غلام کو بلاکر پوچھا کہ تیرے آقا کامال وزر کہاں دفن ہے۔غلام نے بتانے سے انکار کردیا۔اس پر بادشاہ نے اسے انتہائی دکھ دیا۔یہاں تک کہ شکنجے میں کس کراس کی ہڈیاں توڑ دیں۔لیکن اس نے اپنے آقا سے بے وفائی نہ کی۔اس پر خواب میں ایک فرشتے نے اس گستاخ درویش سے کہا۔

کہ اے گستاخ! بندہ بننا اس غلام سے سیکھ۔اور پھر خدا کی بندہ پروری کا تماشا دیکھ۔

۱۷۸۔ بدآواز مؤذن

ایک قافلے میں ایک ایسا شخص بھی شامل تھا۔جس کی آواز نہایت مکروہ تھی۔لیکن اسے یہ غلط فہمی تھی کہ اس کی آواز پہ دنیا مرتی ہے۔ایک شام جب قافلہ آتش پرستوں کی ایک بستی کے قریب فروکش ہوا۔تو اس نے نمازِ مغرب کے لیے اذان دی۔تھوڑی دیر کے بعد بستی کا ایک شخص مٹھائی کا طبق اٹھائے وہاں آیا۔خوشی میں مؤذن سے لپٹ گیا۔اور بے شمار دعائیں دیں لوگ حیران کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ کسی نے حقیقت پوچھی تو کہنے لگا۔کہ میری جوان لڑکی مائل بہ اسلام ہوگئی تھی۔اس پر نہ سمجھانے کا اثر ہوتا تھا۔اور نہ مارنے کا۔آج اس نے یہ اذان سنی تو پوچھنے لگی۔کہ یہ آواز کیسی ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ یہ اذان ہے۔جو اسلام کا ایک شعار ہے۔یہ سنتے ہی وہ اسلام سے متنفر ہو گئی۔اور ہمارے ہاں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

عیوب کو محاسن سمجھ کر اینٹھنا اور ان کا مظاہرہ کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔

۱۷۹۔ ہندو بچہ

ایک مرتبہ محمود غزنوی کو اسیران جنگ میں ایک ایسا ہندو نوجوان ہاتھ آیا جو بڑا متین ذہین اور عاقل تھا۔محمود نے اسے اپنا نائب اور بیٹا بنالیا۔اس پر اس نوجوان کے آنسو نکل آئے۔شاہ نے وجہ پوچھی۔تو کہنے لگا کہ ہمارے ملک میں سب سے بڑی بددعا یہ ہے کہ تجھے محمود غزنوی لے جائے۔ جب کبھی میری ماں مجھے یہ بددعا دیتی۔تو میرا والد اس پہ سخت ناراض ہوتا۔کہ تو بڑی بے رحم اور سنگ دل عورت ہے۔بچے کے لیے ایسی مہلک اور خوفناک چیز مانگتی ہے۔کاش میرے ماں باپ آج یہاں ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ ان کے تصورات کتنے غلط تھے۔

لوگ درویشی اور تقوٰی سے اس طرح ڈرتے ہیں۔جیسے اس ہندو کے والدین محمود غزنوی سے۔

۱۸۰۔ ریشِ سفید

ایک دانشور نے ایک آدمی سے پوچھا۔ کہ تم بڑے ہو یا تمہاری داڑھی۔ کہا کہ میں داڑھی سے سترہ سال بڑا ہوں۔ دانا نے کہا کہ تمہاری داڑھی بعد میں اُگی اور آج صبح کی طرح سفید ہو گئی ہے۔ لیکن تمہارا دل بدستور سیاہ ہے۔

۱۸۱۔ ابوالحسن خرقانیؒ

ابوالحسن خرقانیؒ (م ۳۷۵ھ = ۹۸۵ء) اپنے عہد کے ایک بلند پایہ ولی تھے۔ ایک شخص طویل مسافت طے کر کے ان کی زیارت کو گیا۔ دروازے پہ دستک دی۔ تو ان کی بیوی نے کھڑکی سے سر نکالا۔ اور پوچھا۔ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ کہا کہ میں فلاں شہر سے مرشدی و مولائی حضرت قبلہ ابوالحسن خرقانی کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ بیوی نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا کہ تم ایک مکار، ریاکار، فریبی، غدار اور چور کو دیکھنے کے لیے اتنی دور سے آئے ہو؟ حیف تمہاری عقل پر اور لعنت تمہاری سمجھ پر۔ اس ارادے سے توبہ کرو۔ اور لوٹ جاؤ۔

یہ سن کر وہ شخص الجھن میں پڑ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ ابوالحسنؒ کو ساری دنیا غوث و قطب سمجھتی ہے اور اس کی بیگم اسے ریاکار و مکار قرار دیتی ہے۔ یہ بات کیا ہے؟ چند قدم آگے جا کر کسی سے پوچھا۔ کہ ابوالحسن کہاں ملیں گے۔ کہا کہ وہ اس وقت فلاں جنگل میں ہیں۔ وہ شخص اس جنگل کی طرف چل پڑا۔ آگے جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص شیر پر سوار آ رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں چابک کی جگہ سانپ ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ ابوالحسن خرقانی یہی ہیں۔ آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اور ساتھ ہو لیا۔ حضرت نے حال احوال پوچھا۔ تو اس نے سب سے پہلے ان کے گھر پہ دستک اور بیگم صاحبہ کی باتیں سنائیں۔ اور پوچھا کہ یا حضرت! اس میں راز کیا ہے؟ فرمایا۔ میری موجودہ شان اور یہ مقام اسی بیوی کی وجہ سے ہے۔ میں نے اس کی بدزبانی اور تلخ کلامی پر صبر کیا اور اللہ نے مجھے صبر کا صلہ یوں دیا کہ شیروں اور چیتوں کو میرا مطیع بنا دیا ہے۔

گر نہ صبرم می کشیدے بارِ زن
کے کشیدے شیرِ نر بیگارِ من

(اگر میرا صبر اس عورت کا بوجھ نہ اٹھا سکتا۔ تو آج یہ شیر میرا بوجھ کبھی نہ اٹھاتا)

حرفِ آخر

الحمد للہ! کہ یہ تحریر آج پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی۔ مجھے یہ مرض ہے کہ جب لکھنے بیٹھتا ہوں۔ تو کم از کم بارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا ہوں۔ جون کا مہینہ، قیامت کی گرمی اور بڑھاپا۔ ہر لحہ برہمیٔ صحت کا خطرہ درپیش تھا۔ لیکن رحمت ایزدی نے دستگیری کی اور بخیر و عافیت مجھے منزل تک پہنچا دیا۔

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

یہ کتاب نہ عالمانہ ہے نہ محققانہ۔ بلکہ ایک اصلاحی ''ریڈر'' ہے۔ جس کے مخاطب کالجوں کے نوجوان، اساتذہ اور کارپردازانِ حکومت ہیں۔ اور مقصد نقطۂ نظر کو بدلنا۔ حریم دل میں چراغ ایمان جلانا اور تعلیم مدرسہ کے زہریلے اثرات کو زائل کرنا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ (اقبالؔ)

میں ان اساتذہ سے جو الحاد پہ نازاں ہیں اور ان طلبہ سے جو بے راہی، عیش کوشی، اسلامی اقدار کی پامالی اور لاابالیانہ پن پہ اتراتے ہیں، اپیل کرتا ہوں کہ وہ اللہ کی طرف واپس آئیں کہ اس کے بغیر نہ توان کی شخصیت چمکے گی، نہ بصیرت پیدا ہوگی۔ نہ نظر ملے گی اور نہ منزل اللہ سرچشمۂ نور و توانائی ہے۔ اور جو لوگ اللہ سے بھاگیں گے۔ وہ اندھیرے میں سدا ٹھوکر کھاتے رہیں گے۔ ان کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اور وہ سکون و مسرت سے محروم رہ جائیں گے۔

مصنف کی دیگر کتب

- من کی دنیا
- دو قرآن
- معجم القرآن
- معجم البلدان
- تاریخ حدیث
- عظیم کائنات کا عظیم خدا
- بھائی بھائی
- رمز ایمان
- دانش عرب و عجم

- دانش رومی و سعدی
- میری آخری کتاب
- یورپ پر اسلام کے احسان
- فرمانروایان اسلام
- مضامین برق
- حرف محرمانہ
- سلاطین اسلام
- مضامین برق

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور